اساسِ دین کی تعمیر

صدرالدین اصلاحی

مرکزی مکتبہ جماعتِ اسلامی پاکستان

اچھرہ - لاہور

MUNIC... ARY
Na ka a
Sahib.

اساسِ دین کی تعمیر

از

صدرالدین اصلاحی

شائع کردہ

مرکزی مکتبہ جماعت اسلامی پاکستان

اچھرہ —— لاہور

قیمت تین روپے

MC LIBRARY Nankana Sahib
02160NS
21-9-2022
Managed by Chughtai Public Library

297.7
S124A
1955

عبد الوحید خاں
ناظم مرکزی مکتبہ جماعت اسلامی پاکستان نے کریسنٹ پرنٹنگ پریس
میں طبع کرا کے اچھرہ لاہور سے شائع کیا

طبع اوّل ۱۹۵۵ء ۱۱۰۰
قیمت تین روپے

فہرست مضامین

باب چہارم - نماز

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

مقدمہ

دین اللہ تعالیٰ کی سب سے بڑی نعمت ہے۔ اس نعمت کی صحیح قدر شناسی ہی میں فلاح انسانی کا راز پوشیدہ ہے یہ کام اگرچہ حد سے زیادہ مشکل ہے، مگر اس سے کہیں زیادہ ضروری بھی ہے۔ دین کی اصل قدر شناسی نہ تو اس کے فضائل کو ماننے اور سراہنے کا نام ہے نہ ہی اپنے ذوق سے اس کی صورت گری کرنے اور اپنے اجتہاد سے اس کی راہ و منزل متعین کرنے کا۔ بلکہ اس کی اصل قدر شناسی یہ ہے کہ اس کو اس کی اپنی شکل میں دیکھا اور پھر اس سے حقیقی لگاؤ پیدا کیا جائے۔ فکری، علمی، عملی اور جذباتی لگاؤ۔ ایسا لگاؤ کہ وہی زندگی کا تنہا رہنما ہو۔

اس لگاؤ کے پیدا کرنے کا مسئلہ بھی بعینہ اتنا ہی مشکل اور قابل توجہ ہے جتنا کہ وہ خود۔ ظاہر ہے کہ اس مسئلہ کا صحیح حل کتاب اللہ، سنت رسولؐ اور اسوہ صحابہؓ ہی سے معلوم کیا جاسکتا ہے۔ لیکن جب سے ہمارے دینی افکار اور اعمال پر انحطاط کا دورہ شروع ہوا ہے، دیگر مسائل کی طرح یہ مسئلہ بھی بہت کچھ متاثر ہو چکا ہے اور آج اس کے حل کی جو صورتیں پیش کی جاتی ہیں ان پر اظہار اطمینان کرنا بہت دشوار ہے علیٰ ہذا القیاس ان کے جو نتائج برآمد ہو رہے ہیں انہیں بعض حالات میں تو ہرگز پسندیدہ نہیں کہا جاسکتا۔ چونکہ سوچتے وقت اصل ماخذوں کو صحیح طور سے پیش نظر نہیں رکھا گیا اس لیے تعجب نہ کرنا چاہیے اگر بہت سی ضروری باتیں بے جانے سے رہ گئیں، اور کتنی ہی غیر ضروری باتیں تقاضائے دین بنا دی گئیں۔

اس کتاب میں اس عام روش سے ہٹ کر مسئلہ زیر بحث کو خالص کتاب و سنت کی روشنی میں حل کرنے کی کوشش کی گئی ہے، اس لیے لازماً اس میں بہت کچھ اجنبیت نظر آئے گی۔ مگر فی الواقع یہ اجنبیت نہیں بلکہ انتہائی قدامت ہے، جس کا پہچان لینا دشوار نہیں بشرطیکہ دین کی اصل حقیقت، اصل ضرورت اور اصل غایت ذہن میں مستحضر ہو۔

چونکہ دین کے اس اہم ترین مسئلہ پر آئندہ سطروں میں جو کچھ کہا گیا ہے وہ مذاق عام سے بہت کچھ مختلف ہے اس لیے گفتگو اصولی باتوں سے آگے نہیں بڑھ سکی ہے اور نہ جزئیات و تفصیلات میں جانے کا موقع ملا ہے۔ ایسا ہونا ایک قدرتی اور ضروری امر تھا۔ فکر و نظر کے جب کچھ نامانوس گوشے سامنے لائے جاتے ہیں تو وہ خواہ کتنے ہی مبنی بر حقیقت کیوں نہ ہوں مگر ذہنوں میں ان کی اہمیت بٹھانے کے لیے ساری گفتگو صرف اصولی نکتوں تک ہی محدود رکھنی پڑتی ہے۔

امید ہے کہ کتاب پڑھتے وقت یہ باتیں سامنے رہیں گی۔

صدر الدین

۱۱، رجب سنہ ۱۳۷۱ھ

بسمِ اللّٰہِ الرّحمٰنِ الرّحیم

باب اوّل

اساساتِ دین

اساسِ کار کی اہمیت جس طرح کسی مکان کے لیے ضروری ہے کہ اس کی ایک بنیاد ہو جس پر اس کی دیواریں اٹھائی جائیں، اور پھر ان دیواروں پر اس کی چھت تعمیر کی جائے۔ اسی طرح یہ بھی ضروری ہے کہ یہ بنیاد اتنی گہری اور مضبوط ہو جو دیواروں کا اور چھت کا بار اچھی طرح سنبھال سکے۔ ورنہ وہ مکان ہوا کے ایک تیز جھونکے یا بارش کے کسی ایک تند حملے کی بھی تاب نہ لا سکے گا اور اس کو، خواہ اس کی دیواریں اور چھتیں اپنی جگہ کتنی ہی ٹھوس اور پائیدار کیوں نہ ہوں، ایک کھنڈر کی شکل میں تبدیل ہو جانے سے کوئی شے بچا نہ سکے گی۔ پس ایک دانا اور دور اندیش انجنیئر کبھی اس اصول کو فراموش نہیں کر سکتا کہ جس جسامت اور وزن کی دیواریں اور چھتیں بنائی ہوں، اسی کے تناسب سے

بنیاد میں گہرائی اور پائیداری کا لحاظ رکھنا چاہیے۔ اگر ایک پھوس کا چھپر بنانا ہے تو کچی اینٹوں کی فٹ دو فٹ گہری بنیاد، بلکہ لکڑی کے معمولی کھمبے، جو بالشت دو بالشت زمین میں گڑے ہوں، اس کے لیے کافی ہیں۔ اگر کسی اوسط درجے کے مکان کی تعمیر پیش نظر ہو تو اس کے لیے کم از کم دو تین فٹ گہری اور تقریباً اتنی ہی چوڑی بنیاد اٹھائے بغیر کوئی چارہ نہیں، لیکن اگر ایک وسیع اور عالی شان محل تعمیر کرنا ہو، جس کی دیواروں اور چھتوں میں لکڑی، بانس، کچی اینٹ اور پھوس، کھپڑے یا سلیٹ کے بجائے پختہ اینٹیں، لوہے کی سلاخیں اور گرڈر چنے جانے والے ہوں، تو لامحالہ اس کی بنیادیں بھی کئی فٹ گہری اور چوڑی بنانی پڑیں گی، اور ان میں مٹی یا کچی اینٹیں نہیں، بلکہ وہی پختہ اینٹیں اور سیمنٹ اور آہنی سلاخیں دینی ہوں گی۔ ایک پاگل ہی یہ تصور کر سکتا ہے، یا عملاً ایسی حرکت کر سکتا ہے، کہ چاہتو رہا ہے اہرام مصری کو شرما دینے والی عمارت بنانے اور اس کے لیے بنیاد کھودی ہو انگلیوں اور بالشتوں سے ناپ کر۔

اب ذرا اسی اصول کو لیے ہوئے محسوسات کی دنیا سے نکل کر معانی اور معقولات کے عالم میں آیئے، جہاں اس اصول کی اہمیت اور ناگزیری عالم محسوسات کے مقابلہ میں اتنی ہی زیادہ سزاوار ترجیح ہے جتنی خود عقل و معنی حس کے، اور روح، جسم کے مقابلہ میں۔ کیونکہ اگر وہاں اس اصول کو فراموش کر دینے کا نتیجہ اینٹ اور چونے کی ایک عمارت کی تباہی، اور چاندی کے چند سکوں

کی بربادی کی شکل میں نکلتا ہے تو یہاں بسا اوقات ساری زندگی کی جاں فشانیوں اور قربانیوں ہی پر پانی پھر جاتا ہے۔ اور یہ اتنی بڑی اندوہناک زیاں کاری ہے جس سے بچنے کے لیے کوئی ہوش مند انسان اپنی کسی ممکن سعی سے دریغ نہیں کر سکتا۔ وہ کسی اہم انقلابی مقصد کے حصول اور کسی زبردست اصلاحی اسکیم کے قیام و نفاذ کے سلسلہ میں سب کچھ بھول سکتا، اور ہر شے سے اغماض برت سکتا ہے، مگر یہ نہیں ہو سکتا کہ ایک لمحہ کے لیے بھی اس کا ذہن اس کی بنیاد کی صحیح تاسیس سے غافل ہو جائے۔ وہ اپنی تمام تر مساعی کا اوّلین ہدف اسی ایک چیز کو بنانے پر مجبور ہے کہ جس مقصد اور نصب العین کو لے کر وہ اٹھا ہے اس کے لیے اس کی وسعت اور عظمت کے مناسب اساس فراہم کرے، یعنی اس کی اساس میں اتنی گہرائی اور پختگی پیدا کر لینے کا اہتمام کرے جو آگے چل کر اس راہ کی مشکلوں اور ذمہ داریوں کا بوجھ پوری طرح سہار لے جائے۔

طاعتِ حق کا فرضِ گراں

دینِ حق کی علم برداری، یعنی اس کی اطاعت اور اقامت جس کے از روئے قرآن تمام اہل ایمان مکلف ہیں، ایک ایسا نصب العین ہے جس کی مشکلات کی بے پایانی اور جس کی ذمہ داریوں کی گراں باری اپنا کوئی نظیر نہیں رکھتی۔ دوست اور دشمن، موافق اور مخالف، مومن اور منکر، سب اس امر واقعی کا یکساں اعتراف کرتے ہیں۔ غیر اس کا اظہار اس نصب العین کی خاطر تگ و دو کرنے والوں کو علانیہ

فریب خوردہ بلکہ مجنوں کہہ کر کرتے ہیں، اور جو یگانے ہیں وہ اس کا اعلان اس کی کامیابی کو ناممکن، بتا کر فرماتے ہیں. لیکن الفاظ کے بدلنے سے حقیقت نہیں بدل جاتی. پہلا گروہ مخالف ہونے کے سبب کسی تکلف کی ضرورت نہیں سمجھتا اس لیے اپنے اس نظریے کو بالکل عریاں لفظوں میں ظاہر کر دیتا ہے لیکن دوسرا "پاس شریعت" میں یا اپنے ادعائے ایمان کی لاج رکھنے کی خاطر اپنے اندر اس بے حجاب جسارت کی تاب نہیں رکھتا، اس لیے سیاسی صیقل گری سے کام لیتے ہوئے اپنے اس خیال کو اک گونہ شائستگی اور خوشنمائی کا رنگ دے کر بیان کرتا ہے.

بہر حال جہاں تک اس کام کی دشواریوں اور صبر آزمائیوں کا تعلق ہے، سارے اہل جہاں یک زبان ہو کر پکارتے ہیں کہ اس وادئ جنوں میں قدم رکھنا ہر مرد کا کام نہیں، حد یہ ہے کہ اس نظریہ کی صداقت سے نہ تو اس کو انکار ہے جس نے یہ عظیم الشان ذمہ داری اپنے بندوں پر ڈالی ہے، اور نہ ہی ان کو جنہیں اس کار عظیم کی سربراہ کاری سپرد کر کے اس دنیا میں بھیجا گیا تھا (صلوات اللہ علیہم اجمعین) بلکہ یہ سب کے سب اس سے بھی زیادہ صفائی کے ساتھ اس کو تسلیم کرتے اور اس کا اعلان فرماتے ہیں جتنی صفائی کہ اوروں کے ہاں پائی جاتی ہے چنانچہ یہ خود اللہ تعالیٰ ہی کے الفاظ ہیں:-

اِنَّا عَرَضْنَا الْاَمَانَةَ عَلَى السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَالْجِبَالِ فَاَبَيْنَ	ہم نے یہ "امانت" آسمانوں کے سامنے، زمین کے سامنے اور پہاڑوں کے سامنے پیش کی تھی لیکن

اَنْ یَّحْمِلْنَهَا وَاَشْفَقْنَ مِنْهَا وَ	انہوں نے اس کا بار اُٹھانے سے انکار کر دیا اور
حَمَلَهَا الْاِنْسَانُ اِنَّهٗ كَانَ ظَلُوْمًا	اس سے ڈر گئے پر انسان نے اس کی ذمہ داری
جَهُوْلًا۔	اٹھالی یقیناً وہ بڑا ظالم اور جاہل ہے (احزاب ۷۲)

معلوم ہے کہ یہ "امانت" کونسی تھی جس کا بوجھ اٹھانے کے لیے زمین و آسمان اور پہاڑ جیسی قوی ہیکل مخلوقات بھی تیار نہ ہو سکیں اور اس کے تصور ہی سے لرزہ براندام ہو گئیں؟ وہ امانت یہی اللہ تعالیٰ کے قوانین تشریعی کی امانت تھی جن کی خود بھی اطاعت کرنی تھی اور دوسروں سے بھی کرانی تھی، یعنی دین الٰہی کی اقامت۔ پھر ان الفاظ کو بھی سامنے رکھ لیجئے جو اس امانت کے آخری مُذکّر اور دین حق کے آخری علم بردار (صلی اللہ علیہ وسلم) کو اس منصب پر سرفراز کرتے وقت فرمائے گئے تھے۔

اِنَّا سَنُلْقِیْ عَلَیْكَ قَوْلًا	ہم تم پر ایک بھاری بات کا بوجھ "ڈالنے
ثَقِیْلًا	والے ہیں۔ (مزمل ۵)

یہ "قولِ ثقیل" کس شے کو کہا گیا ہے؟ واقعات شاہد ہیں، بعد میں نازل ہونے والے احکام بتاتے ہیں اور خود آیت کا سیاق و سباق پکارتا ہے کہ اس سے مراد اللہ کی وہی کتاب تھی جس کے نزول کا آغاز ہو چکا تھا اور جس میں بتدریج بنی نوع انسان کے لیے آخری اور مکمل ضابطہ حیات (دین) ہونے کے باعث ایک ایک شعبۂ زندگی سے متعلق قطعی ہدایات آنے والی تھیں، اس لیے لازماً

نبی پر نت نئی ذمہ داریوں کا بارگراں پڑنے والا تھا۔

دین حق کی اقامت کے نصب العین کو ایک مشکل ترین فرض قرار دیے جانے پر یہ خدا کی اپنی گواہی ہے، اور زبان قال سے ہے وَمَنْ اَصْدَقُ مِنَ اللّٰهِ قِیْلًا۔ رہ گئے انبیائے کرام، تو یہ وہ لوگ ہیں جو اس فرض اور اس نصب العین کے اوّلین اور براہِ راست ذمّہ دار ہیں، اس لیے اس کی صبر آزما، تلخ کامیوں کا جتنا شدید اور صحیح احساس ان کو ہو سکتا ہے، اوروں کو ہرگز نہیں ہو سکتا، مگر چونکہ یہ پاکانِ خاص اور یہ مردانِ حق، تسلیم و رضا کے پیکر ہوتے ہیں اس لیے ان کی زبان قال کے لیے تو ممکن نہیں کہ اس سے کسی حرف شکایت کا صدور ہو، مگر زبان حال کی بندش ہرگونہ ان کی دسترس سے باہر تھی، چنانچہ اس زبان نے بارہا درد و کرب سے بھری ہوئی صدائیں بلند کیں تاکہ خدا کا ہاتھ آئے اور ان کی بوجھوں سے دبی ہوئی پشتِ ناتواں کو سہارا دے۔ حَتّٰٓى اِذَا اسْتَيْـَٔسَ الرُّسُلُ وَظَنُّوْٓا اَنَّهُمْ قَدْ كُذِبُوْا جَآءَهُمْ نَصْرُنَا (یہاں تک کہ جب ہمارے پیغمبر مایوس ہو گئے اور کفّار نے سمجھ لیا کہ اب ان پیغمبروں کی دعوت پوری طرح ٹھکرائی جا چکی ہے تو ہماری مدد آ نمودار ہوئی) فغان و التجا کی یہی خاموش صدائیں ہیں جو آیات ذیل کے پسِ پشت خود خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان حال سے بھی سنائی دے رہی ہیں:۔

اَلَمْ نَشْرَحْ لَكَ صَدْرَكَ — کیا ہم نے (اے پیغمبر) تمہارے سینے کو کھول

وَوَضَعْنَا عَنْكَ وِزْرَكَ الَّذِی — نہیں دیا؟ اور تم پر سے وہ بوجھ اتار کر الگ نہیں
اَنْقَضَ ظَهْرَكَ (الم نشرح) — کر دیا جو تمہاری کمر توڑے دے رہا تھا۔

قرآن کا ہر طالب علم جانتا ہے کہ اس کی آیات کا ایک بڑا حصّہ اصلاً صرف پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی اور آپ کے صحابہ کرام کی تسلّی خاطر کے لیے نازل ہوتا رہا ہے۔ آیات ہی نہیں، پوری پوری سورتیں اسی مقصد کو لے کر اتریں۔ جب بھی ایسا ہوا —— اور ایسا ہونا کسی صبح غیر متوقع نہ تھا —— کہ حالات کی ناسازگاریاں قلب مبارک کو توڑنے لگتیں تو فوراً رحمتِ الٰہی حرکت میں آتی اور الفاظ قرآن کے لباس میں نمودار ہو کر ٹوٹتے ہوئے دل کو سنبھالتی، ڈھارس بندھاتی اور ایک نئے جوش اور ایک تازہ عزیمت کی توانائیوں سے اسے معمور کر دیتی، تاکہ اسی استقلال کے ساتھ تبلیغ و اقامت حق کا کام پیہم جاری رہے جو اس کے لیے مطلوب تھا۔ اور اگر ایسا نہ ہوتا تو کون کہہ سکتا ہے کہ ایک انسان جو اگرچہ افضل البشر اور سرتاج انبیاؑ ہی کیوں نہ تھا، ان ہولناک کشاکشوں اور ناسازگاریوں کے طوفان میں قدم جمائے کھڑا رہ سکتا تھا جو نبوّت کے پورے تئیس سالہ دور میں اس کے اِردگرد چھائی رہیں؟ خود قرآن کا کہنا ہے کہ ایسا ہرگز ممکن نہ تھا۔

لَوْلَا اَنْ ثَبَّتْنَاكَ لَقَدْ — اے محمدؐ اگر ہم تم کو دعوتِ حق پر جمائے نہ
كِدْتَّ تَرْكَنُ اِلَيْهِمْ شَيْئًا — رکھتے تو قریب تھا کہ تم ان کافروں کی طرف کچھ
قَلِيْلًا۔ (بنی اسرائیل ع ۸) — نہ کچھ ضرور جھک پڑتے۔

چنانچہ قرآن کی تنزیل میں جو اتنی لمبی مدت صرف کی گئی اس کی سب سے بڑی مصلحت یہی تھی کہ منصب رسالت کی ذمہ داریوں میں ایک تدریج کے ساتھ وسعت پیدا کی جائے تاکہ قلب نبوی ان کا بحسن وخوبی تحمل کر سکے۔ اگرچہ کفار اشرار نے اس طریقہ تنزیل کو اپنی دانست میں ایک زبردست اعتراض کا منبع بنایا تھا اور بڑی اونچی آوازوں میں لوگوں کو یہ نفسیاتی مغالطہ دیتے رہے کہ اب تک جتنی آسمانی کتابیں اتری ہیں ان میں سے ہر ایک بیک دفعہ نازل کر دی گئی تھی مگر یہ ایک نئے قسم کی آسمانی کتاب ہے کہ مہینے پر مہینے اور سال پر سال گذرے جارہے ہیں اس کا زمانۂ نزول ختم ہونے ہی کو نہیں آتا! حقیقت یہ ہے کہ یہ مدعی نبوت اپنے چند سازشی حواریوں کی مدد سے شبانہ روز کاوشیں اور دماغ سوزیاں کر کے اپنا یہ "قرآن" گھڑتا ہے اور جب کچھ جملے گھڑ پاتا ہے تو اسے وحی الٰہی کے نام سے لوگوں کو سنانے لگتا ہے۔ وَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا اِنْ هٰذَا اِلَّا اِفْكُ نِ افْتَرٰهُ وَاَعَانَهٗ عَلَيْهِ قَوْمٌ اٰخَرُوْنَ فَقَدْ جَآءُوْ ظُلْمًا وَّزُوْرًا وَقَالُوْٓا اَسَاطِيْرُ الْاَوَّلِيْنَ اكْتَتَبَهَا فَهِيَ تُمْلٰى عَلَيْهِ بُكْرَةً وَّاَصِيْلًا (کافروں کا کہنا ہے کہ یہ قرآن تو سارے کا سارا من گھڑت ہے جسے اس نے گھڑ لیا ہے۔ اور کچھ اور لوگوں نے اس معاملہ میں اس کی مدد کی ہے۔ یہ لوگ صریح ظلم اور جھوٹ کے مرتکب ہو رہے ہیں۔ نیز ان کا کہنا ہے کہ یہ تو پچھلوں کی داستان ہے جسے اس نے خود لکھ لیا ہے اور جو صبح شام اسے لکھائی جاتی ہے)۔ وَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَوْلَا نُزِّلَ عَلَيْهِ الْقُرْاٰنُ جُمْلَةً وَّاحِدَةً (کافر کہتے

ہیں کہ اس شخص پر قرآن یک دفعہ کیوں نہ اتار دیا گیا؟ لیکن حکمت الٰہی نے ان کے ان عوام فریب نفسیاتی مغالطوں کی طرف مطلق توجہ نہ کی، ہاں ان کے لیے جو کان اور آنکھیں رکھتے تھے، دو لفظ فرما کر اپنی حکیمانہ مصلحت پر سے پردہ اٹھا دیا۔

كَذَٰلِكَ لِنُثَبِّتَ بِهِ فُؤَادَكَ — ہاں ایسا ہی کر رہے ہیں تاکہ (اے پیغمبر!) تمہارے قلب میں قوت اور رجاؤ پیدا کرتے رہیں (الفرقان۔ ۳۲)

اس ساری تفصیل سے یہ حقیقت اچھی طرح ذہن نشین ہو جاتی ہے کہ دین حق کی کامل اطاعت اور اس کی تبلیغ واقامت دنیا کا وہ دشوار ترین فرض ہے جس کی غیر محدود مشکلات کی یکتائی پر پوری کائنات یک زبان ہو کر شہادت دے چکی ہے اور اس شہادت کی سچائی پر اس کا علیم وخبیر خالق بھی مہر تصدیق ثبت کر چکا ہے۔ ہر چند کہ چمکتی ہوئی دوپہر میں سورج کی طرف انگلی اٹھا کر بتانے اور اس کی شکل وہیئت پر کسی تبصرہ کی ہرگز کوئی ضرورت نہیں، مگر انسانی نفوس کا عجیب حال ہے، جس بات کو ہم نظری طور پر شک وریب سے بالاتر سمجھتے ہیں، بسا اوقات عمل کی دنیا میں اس کے اولین مقتضیات تک کو فراموش کر بیٹھتے ہیں۔ ہم دیکھنے کے باوجود بہت سی باتوں کو نہیں دیکھتے اور جاننے کے باوجود جتائے جانے کے محتاج ہوتے ہیں۔ اس لیے ضرورت ہے کہ جو چیز اب تک محض بحث ونظر کی حد تک ہمارے نزدیک مسلم تھی، اس کو عمل واقدام کے نقطۂ نگاہ سے دیکھ لیا جائے، اور ایک شخص، جو اللہ اور اس کے رسول کی کامل اطاعت ورضا جوئی کا عہد کر لینے کے باعث

چار و ناچار اقامت دین کا فرض بجا لانے پر مامور ہے، پہلے دن سے اس فرض کی حوصلہ آزما گھاٹیوں کا نقشہ اپنی چشم تصور کے سامنے رکھ لے، اور اس طرح رکھ لے کہ کبھی بھی ان کو سامنے سے اوجھل نہ ہونے دے، ورنہ یقین جانئے کہ ان گھاٹیوں کو پار کرنے کے لیے جو سفر وہ شروع کرے گا اس کے لیے ضروری زاد راہ کبھی ساتھ نہ لے گا، جس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ اس کی سعی و جہد کے قدم کبھی منزل مقصود سے آشنا نہ ہوں گے۔

اب جب کہ یہ راہ اتنی دشوار گذار اور یہ نصب العین اتنا عزیمت طلب ہے جس کی تفصیل اوپر آپ نے ملاحظہ فرمائی تو اس کا لازمی تقاضا ہے کہ اس نصب العین کی بنیاد بھی اس انتہائی حد تک عمیق، وسیع اور سنگین رکھی جائے جو اس کے شایانِ شان ہو اور جو اس بھاری بھرکم آہنی عمارت کی دیواروں اور چھتوں کا پورا بوجھ اٹھا سکے۔ ورنہ اگر جلد بازی یا غفلت سے کام لیتے ہوئے اس بنیاد کو کمزور رہنے دیا گیا اور الٹے سیدھے کچھ سنگ ریزے یا اینٹ کے ٹکڑے رکھ کر آگے تعمیر شروع کر دی گئی تو اس سلسلہ میں کسی مکمل اور مستحکم عمارت بن جانے کی توقع کرنا نتیجۃً اس توقع سے ذرا بھی مختلف نہیں جو ایک پیاسا دور سے چمکتی ہوئی ریت کو دیکھ کر قائم کر لیتا ہے، الا آنکہ کسی وقت ہمارے لیے قانونِ فطرت ہی بدل جائے۔

سنگ ہائے اساسِ حق | تعمیر اساس کی اہمیت معلوم کر لینے کے بعد ہمیں اب اس مسئلہ پر غور کرنا ہے کہ وہ کون کون سے پتھر

ہیں جو اس بنیاد میں نصب کیے جانے چاہئیں اور جن کے بغیر یہ عمارت اپنی مطلوبہ حدِ کمال کو نہیں پہنچ سکتی۔ اس سوال کا جواب معلوم کرنے کے لیے ہمیں خصوصیت کے ساتھ ان آیات و احادیث اور اسلامی تاریخ کے ان اوراق پر نظر ڈالنی چاہیے جن کا تعلق آغازِ اسلام یا بالفاظِ دیگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی مکی زندگی سے ہے، کہ دینِ حق یا آسمانی بادشاہت کا وہ حسین اور پُرجلال ایوان جس کی پیشانی پر مشیتِ الٰہی نے اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَیْکُمْ نِعْمَتِیْ کا طغرائے امتیاز دورِ رسالت کے بالکل آخری لمحوں میں تحریر کیا، اس کی بنیاد ان ہی ایام میں ڈالی اور بھری گئی تھی۔ اس بنیاد کے اندر جس کی تعمیر مکمل کرنے میں تیرہ برس کی طویل مدت صرف ہوگئی، محض چند گنے چنے پتھر ہمیں نصب کیے ہوئے دکھائی پڑتے ہیں۔ جن کی دو قسمیں ہیں، ایک تو وہ جس کا تعلق انسان کے شعور اور اعتقاد سے ہے، دوسری جس کا تعلق انسان کے عمل سے ہے۔ پہلی قسم ایمان باللہ اور ایمان بالآخرت پر مشتمل ہے، اور دوسری قسم میں ذکرِ الٰہی اور صبر شامل ہیں۔ یہی چار چیزیں ہیں جن کی روح کو دلوں کے اندر اتار دینے اور جن کے لوازم و مطالبات کے مطابق لوگوں کو اپنی زندگیاں ڈھالنے کے لیے آمادہ کر دینے میں دورِ رسالت کا نصف سے زائد حصہ صرف ہوگیا۔ اس حقیقت کی تفصیلی شہادت تو مکی سورتوں کے صفحات پر دور تک پھیلی نظر آسکتی ہے، لیکن قرآن میں بعض مقامات ایسے بھی آپ کو ملیں گے جہاں یہ حقیقت چند لفظوں میں سمیٹ کر بیان کر دی گئی ہے،

اور ایسے نمایاں طور پر، کہ کوئی خفا یا ابہام یا اشتباہ نگاہ جستجو کے سامنے حائل نہیں ہو سکتا۔ مثلاً جس وقت اسلام کی دعوت انتہائی ناسازگار اور پُرہول منزل سے گذر رہی تھی اور اس کے علمبردار سخت ہولناک حالات سے دوچار تھے، اس وقت مسلمانوں کو ان حالات کا مقابلہ کرنے کے لیے ہدایت کی گئی :-

یَآ اَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اسْتَعِیْنُوْا	اے وہ لوگو! جو ایمان لا چکے ہو! صبر اور
بِالصَّبْرِ وَالصَّلٰوۃِ اِنَّ اللّٰہَ مَعَ	نماز سے مدد حاصل کرو، یقیناً اللہ تعالےٰ
الصّٰبِرِیْنَ ۔ (بقرہ)	صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے

اس ہدایت کے الفاظ پر غور کیجئے، ان میں یَآ اَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا کہہ کر صبر اور نماز کی تلقین کی گئی ہے۔ جس کا واضح مطلب یہ ہوا کہ پیروی حق کے لیے دو قسم کی چیزیں لازم ہیں۔ ایک تو یہ کہ اعتقادی طور پر اَلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا (یعنی اللہ اور یوم آخرت پر یقین کامل رکھنے والوں) میں شرکت ہو، دوسری یہ کہ عملی طور پر صبر اور نماز کی پناہ پکڑی جائے۔ یہ حقیقت آپ کو اور زیادہ وضاحت کے ساتھ سورۂ طٰہٰ کی ان آیتوں میں نظر آئے گی۔ جن میں حضرت موسیٰ علیہ السّلام کی دی ہوئی اوّلین ہدایات کا غالباً ایک مجمل خلاصہ بیان کیا گیا ہے :-

فَلَمَّآ اَتٰھَا نُوْدِیَ یٰمُوْسٰی	سو جب وہ آگ کے پاس پہنچے تو آواز آئی
اِنِّیْٓ اَنَا رَبُّکَ فَاخْلَعْ نَعْلَیْکَ اِنَّکَ	اے موسیٰ! یقیناً میں تیرا رب ہوں۔ پس تم
بِالْوَادِ الْمُقَدَّسِ طُوًی وَاَنَا	اپنی جوتیاں اتار دو کیوں کہ تم اس وقت

اَخْتَرْتُكَ فَاسْتَمِعْ بِمَا يُوحٰى	پاک میدان یعنی طویٰ میں ہو۔ اور دیکھو
اِنَّنِیْ اَنَا اللّٰہُ لَا اِلٰہَ اِلَّا اَنَا	میں نے تم کو دبار رسالت سنبھالنے کے لیے
فَاعْبُدْنِیْ وَاَقِمِ الصَّلٰوۃَ	چن لیا ہے، سو اس وقت تم پر جو کچھ وحی کی جا
لِذِکْرِیْ اِنَّ السَّاعَۃَ اٰتِیَۃٌ	رہی ہے اس کو غور سے سنو، میں اللہ ہوں
اَکَادُ اُخْفِیْھَا لِتُجْزٰی کُلُّ	میرے سوا کوئی حقیقی معبود نہیں، اس لیے
نَفْسٍ بِمَا تَسْعٰی۔ فَلَا یَصُدَّنَّکَ	میری ہی بندگی کرو، اور میری یاد کے لیے نماز
عَنْھَا مَنْ لَا یُؤْمِنُ بِھَا وَاتَّبَعَ	قائم کرو، یقین رکھو کہ قیامت آکر رہے گی جس
ھَوٰاہُ فَتَرْدٰی۔	کو ابھی مخلوق کی نگاہوں سے امیں چھپائے رکھوں

گا (اور یہ اس لیے) تاکہ ہر جان کو اپنے کیے کا بدلہ مل جائے۔ تو دیکھو وہ لوگ تمہیں اس (نماز) سے باز رکھنے پائیں جو اس (یوم الحساب) کے آنے کا یقین نہیں رکھتے اور اپنی خواہشات نفس کے پیچھے چلے جا رہے ہیں ورنہ اس طرح تم تباہ ہو کر رہ جاؤ گے۔

ان آیات پر اساسات دین کی تعلیم کا سلسلہ ختم ہو جاتا ہے اور آگے فرعون کے پاس جا کر اس کی تبلیغ کا حکم مل جاتا ہے۔ صاف نظر آتا ہے کہ ان آیتوں میں بھی انہی چار باتوں کی تلقین کی گئی ہے جن کا ہم نے اوپر ذکر کیا ہے۔ سب سے پہلے تو توحید (یعنی ایمان باللہ) کا درس دیا ہے، پھر ذکر اور نماز کا حکم دیا گیا ہے، اس کے بعد قیامت کے آنے اور اعمال انسانی کی جزا کا یقین دلایا گیا ہے، اور

آخر میں فَلَا یَصُدَّنَّکَ عَنْہَا مَنْ لَّا یُؤْمِنُ بِہَا کہہ کر اس امر کی تاکید کی گئی ہے کہ اس راہِ حق پرستی اور اس کے لوازم سے تمہیں باز رکھنے کے لیے کفر کا کید اور اقتدار خواہ کتنا ہی ایڑی چوٹی کا زور لگائے تمہیں صبر واستقلال کا دامن ہرگز ہاتھ سے نہ دینا چاہیے۔ ان ارشادات الٰہی کے اوّلین اور براہ راست مخاطب خود حضرت موسیٰ علیہ السلام ہیں، رہے بعد میں ان کے ہونے والے پیرو، تو ظاہر ہے کہ اپنے ہادی کی تبعیت میں وہ بھی اسی کے مخاطب ہوں گے۔ جس کا صریح مطلب یہ ہوا کہ فرائض نبوت انجام دینے کے لیے بھی اور انبیاء کے سچے اتباع کے لیے بھی، یعنی دین حق کی اطاعت واقامت کے لیے بنیادی طور پر جن چیزوں کی ضرورت ہے وہ یہی چار چیزیں ہیں۔

نہ صرف یہ کہ انبیاء علیہم السلام اور ان کے اصحاب ہی کو، اور کسی دعوتِ حق کے آغاز ہی میں تعمیر دین کی یہ اساس بتائی گئی تھی، بلکہ جب کسی دعوت کے پژمردہ اور غافل علمبرداروں سے اپنی ذمہ داریوں کے از سرِ نو سنبھالنے کا مطالبہ کیا گیا تو دعوت کی اس نشاۃ ثانیہ کے لیے بھی علاج اور ترتیب کا یہی بتائی گئی، اور جب انہوں نے اس مطالبہ کے وقت اطاعت واقامتِ دین کی دشوار گذار وادی کی طرف نظریں ڈال کر دہشت زدگی کی جھرجھری لی تو شافیِ مطلق نے ان سے کہا کہ ڈرو نہیں، نہ پست ہمت بنو، راہ دشوار سہی لیکن اس دشواری کا علاج معلوم ومشہور ہے اور ہزار ہا بار کا مجرب بھی، آؤ اسے آزماؤ، دشواریاں غبارِ

کر چھٹ جائیں گی۔ سورہ بقرہ کی چالیسویں (۴۰) آیت سے پڑھنا شروع کیجئے، تین چار آیتوں تک بنی اسرائیل سے اس عہد کو از سرِ نو پورا کرنے کا پر زور مطالبہ ہے جو انہوں نے اپنے رب سے باندھ رکھا تھا۔ اس مطالبہ کے ساتھ ہی یہ بات بالکل قدرتی اور یقینی تھی کہ چشمِ تصور کے سامنے ان صبر آزما حالات اور جاں گسل مشکلات کے تاریک سایے حرکت کرنے لگیں جو اس کارِ دشوار کے لوازم میں سے ہیں۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے انہیں سامنے رکھتے ہوئے آگے فرمایا:۔

وَاسْتَعِيْنُوْا بِالصَّبْرِ وَالصَّلٰوةِ وَاِنَّهَا لَكَبِيْرَةٌ اِلَّا عَلَى الْخَاشِعِيْنَ الَّذِيْنَ يَظُنُّوْنَ اَنَّهُمْ مُلٰقُوْا رَبِّهِمْ وَاَنَّهُمْ اِلَيْهِ رَاجِعُوْنَ	اور (اس ایفائے عہدِ الٰہی کے کام میں) صبر اور نماز سے مدد لو، بلاشبہ یہ نماز ان لوگوں کو چھوڑ کر اوروں کے لیے سخت گراں ہے جن کے دلوں میں اللہ کا خشوع ہو اور جو اس امر کا یقین رکھتے ہوں کہ انہیں ضرور اپنے رب سے ملنا ہے اور اسی کے حضور پلٹ کر جانا ہے۔

یاد رہے کہ خطاب ایسے لوگوں سے ہے جو مدعیٔ ایمان ہیں، اور موقعِ گفتگو بجائے انذار و توبیخ کے دعوت و ترغیب کا ہے، اس لیے ان سے صراحتاً یوں نہیں کہا گیا کہ تمہارے اندر خدا اور آخرت کا یقین مردہ ہو چکا ہے پہلے اسے زندہ کرو، اور پھر صبر و نماز سے مدد لو، بلکہ ترتیب بدل دی گئی؛ اور صبر و نماز ہی سے کلام کی ابتدا کی گئی، یعنی اساساتِ دین کے اعتقادی حصے سے، جو

اصولاً مقدم ہیں، کلام کو شروع کرنے کی بجائے اس کے عملی حصّے سے شروع کیا گیا۔ اس طرح گویا ان کے ادعائے ایمان کی بابت ایک طرح کی خاموشی اختیار کر لی گئی، اور ایسا کرنا، جیسا کہ ابھی عرض کیا گیا، موقع و محل کے لحاظ سے ضروری تھا۔ لیکن جس طرح یہ ضروری تھا کہ شروع ہی میں ان سے ایمان باللہ اور ایمان بالآخرۃ کا بالتصریح مطالبہ نہ کر دیا جائے اسی طرح یہ بھی ناممکن تھا کہ اس باب میں مکمّل سکوت اختیار کر لیا جاتا، اور ان کی اساس دین کے کھوکھلے پن کا اصلی راز انہیں نہ بتایا جاتا۔ چنانچہ کلام الٰہی نے نماز کے ذکر کو خاص انداز سے ذرا وسعت دے دی اور اس وسعت نے اس راز کو انتہائی خوش ادائی کے ساتھ اپنے دامنوں میں لے لیا، اتنی خوش ادائی کے ساتھ کہ جس ایمان باللہ اور ایمان بالآخرت کے مطالبے کو پہلے صراحت کے ساتھ بیان کرنے سے اجتناب کیا گیا تھا، وہ اشاروں میں بالکل کھل کر سامنے آ گیا، اور ایسے موثر انداز میں آ گیا کہ صراحت کے ساتھ کہے جانے کی شکل میں یہ تاثیر ہرگز نہ پیدا ہو سکتی تھی۔ فرمایا گیا کہ "صبر اور نماز سے مدد حاصل کرو"۔ پھر فرمایا گیا کہ صبر و استقامت کا دشوار ہونا تو ایک کھلی بات ہے مگر یقین رکھو نماز (بھی) ان لوگوں کے لیے کچھ کم گراں اور دشوار نہیں جو اپنے اندر اللہ کا خشوع اور اس کے روبرو حساب کی خاطر حاضری کا اندیشہ نہیں رکھتے"۔ اس سے ایک طرف تو انہیں یہ معلوم کرایا گیا کہ خود نماز پر مداومت اسی وقت ہو سکتی ہے جب کہ دل میں اللہ تعالیٰ

پر ایمان، اس کا خوف اور خشوع موجود ہو، نیز محاسبۂ آخرت پر کامل یقین ہو، دوسری طرف یہ حقیقت بھی بے حجاب فرمائی گئی کہ ان (بنی اسرائیل) کے اندر سے یہ دونوں یقین زائل، یا انتہائی حد تک مضمحل ہو چکے ہیں، اور دراصل یہی ان کی ساری بدبختیوں کی جڑ ہے۔ جب تک وہ اپنے سینوں کو از سرِ نو اس یقین سے آباد نہ کریں گے، نہ تو وہ دین کے تقاضوں پر عمل کر سکیں گے، نہ اس کی مشکلات پر صبر و ثبات کا مظاہرہ کر سکیں گے۔ اور جب یہ کچھ نہ ہو گا تو حق پرستی اور دین داری کا دروازہ بدستور ان کے سامنے بند ہی رہے گا۔

جیسا کہ ہم کہہ چکے ہیں، یہی وہ بنیادی تعلیمات تھیں جن کو پیغمبر عربی صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی اپنی تعلیم اور تزکیہ کا مرکز بنایا تھا، اس لیے ضرورت ہے کہ آپ کے اسوۂ حسنہ کو اپنے لیے سرچشمۂ ہدایت ماننے والے بھی اپنی نگاہ کو اسی مرکز پر جمائے رہیں، اور اس کامل یقین کے ساتھ جمائے رہیں کہ دینِ حق کی اقامت کے لیے جس سر و سامانِ کار کی ضرورت ہے اس کی تیاری کے لیے قدرت نے صرف یہی "چار کارخانے" بنائے ہیں۔ دنیا کے دوسرے تمام کارخانوں کے ڈھلے ہوئے کل پرزے میجنو اور سگفریڈ لائینس تو بنا سکتے ہیں مگر مسجد قبا کا ایک گوشہ بھی تعمیر نہیں کر سکتے۔ اب جب کہ یہ چیزیں اتنی اہمیت رکھتی ہیں کہ ہماری کامیاب مساعی کا سارا انحصار انہی پر ہے، ہمارے لیے ناگزیر ہے کہ ہم ان کے متعلق ایک ایک بات سے پوری واقفیت بہم پہنچا لیں اور اچھی طرح یہ جان لیں کہ ان کی حقیقت

کیا ہے؟ ان کے مطالبات و مقتضیات کیا ہیں؟ یہ اقامتِ دین کے نصب العین کے حصول میں کیوں ضروری ہیں اور کیوں کر اور کس حد تک انسان کو اس کام کے لیے تیار کرتی ہیں؟ اور آخر میں یہ کہ آنحضرت کی زندگی میں ان کی عملی تفصیلات کس نوع کی ہیں؟

باب دوم

ایمان باللہ

اصل بنائے دین

ایمان باللہ بنائے دین کا سب سے پہلا پتھر ہے اور اسی لیے سب سے زیادہ اہم بھی ہے، اس قدر اہم کہ اس کے بغیر وجود اسلام کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ اور اگر گہری نظر سے دیکھا جائے تو فی الواقع جس شے کو سنگِ بنیاد کہا جا سکتا ہے، وہ صرف یہی ایمان باللہ ہے، اور نہ صرف دوسرے تمام اصول و احکام اسلامی بلکہ خود مذکورہ بالا وہ تینوں چیزیں بھی، جن کو ہم نے "سنگہائے اساس" میں شمار کیا ہے اس کے مقابلہ میں فروع کی حیثیت رکھتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ جب کبھی موقع بیان اس امر کا متقاضی ہوتا ہے کہ دین و شریعت کی ساری صداقتوں کو بیان کرنے کی بجائے کم سے کم لفظوں میں ان کا مغز اور جوہر مخاطب کے سامنے رکھ دیا جائے؛ تو کلام الٰہی اور کلام رسول، دونوں ہی میں صرف ایمان باللہ کا ذکر کر دیا جاتا ہے، اور فروع تو فروع،

دیگر اصولی ایمانیات کی طرف سے بھی سکوت اختیار کر لیا جاتا ہے۔ مثلاً قرآن ایک جگہ کہتا ہے:۔

إِنَّ الَّذِينَ قَالُوا رَبُّنَا اللَّهُ ثُمَّ اسْتَقَامُوا تَتَنَزَّلُ عَلَيْهِمُ الْمَلَائِكَةُ أَلَّا تَخَافُوا وَلَا تَحْزَنُوا وَأَبْشِرُوا بِالْجَنَّةِ الَّتِي كُنتُمْ تُوعَدُونَ۔ (حم السجدہ ۴)	یقیناً ان لوگوں پر جنہوں نے کہا کہ "ہمارا رب تو اللہ ہے" اور پھر اپنے اس قول پر پوری طرح جمے رہے، فرشتے یہ پیام لے کر اترتے ہیں کہ نہ تمہیں کسی شے کا ڈر ہونا چاہئے نہ کسی چیز کا غم اور اس جنت پر خوش ہو جاؤ جس کا تم سے وعدہ کیا جاتا رہا ہے

بعینہٖ یہی بات اور یہی انداز گفتگو پیغمبر صلعم کے ارشادات میں بھی موجود ہے، اور بکثرت موجود ہے، جیسے:۔

مَنْ قَالَ لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰه دَخَلَ الْجَنَّةَ	جس نے کہا اللہ کے سوا کوئی حقیقی معبود نہیں وہ جنت میں داخل ہوا۔

اور یہ اس لیے کہ "ایمان باللہ" کہنے میں تو صرف ایک بات ہے مگر اس پر سے ظاہر کا پردہ اٹھا دیجئے اور اس کی گہرائیوں میں ڈوب کر دیکھیے تو اس کی تہ میں معانی وحقائق دینی کی پوری دنیا آباد نظر آئے گی جس کسی کو اللہ تعالیٰ کی ذات اور اس کی تمام صفات کی صحیح معرفت حاصل ہو گی اس کو پھر نہ یہ بتانے کی ضرورت ہے کہ جزا و سزا کا ایک دن آنے والا ہے، نہ وہ اس تذکیر کا محتاج ہے کہ اپنے رب

اور معبود حقیقی کی یاد سانس کی طرح میری زندگی کا ایک لازمی وظیفہ ہے، اور نہ وہ اس تلقین کا منتظر ہو گا کہ اللہ تعالیٰ کی رضاجوئی کے لیے مجھے اس کے احکام کی اطاعت میں کسی کمزوری، کسی دل شکستگی اور مشکلات کے مقابلہ میں کسی مرعوبیت کا شکار نہ ہونا چاہیے۔ بلکہ وہ اسی ایک آفتاب کی روشنی میں یمین ویسار کی ساری صداقتیں خود پالے گا۔ چنانچہ اس کی یہی جامعیت اور بنیادی اور امتیازی اہمیت ہے جس کے باعث ہر نبی پر آنے والی وحی کا آغاز اسی کی تعلیم سے ہوتا رہا ہے۔ طور کی پہاڑی پر اولین صدا جو آئی وہ بھی یہی تھی کہ اِنِّیْ اَنَا رَبُّکَ ...... وَاَنَا اخْتَرْتُکَ فَاسْتَمِعْ لِمَا یُوْحٰی اِنَّنِیْ اَنَا اللّٰہُ لَآ اِلٰہَ اِلَّآ اَنَا فَاعْبُدْنِیْ (موسیٰ بلا شبہ میں ہی تمہارا پروردگار ہوں .... اور میں نے تمہیں پیام رسانی کے لیے منتخب کر لیا ہے، سو ان باتوں کو غور سے سنو جو تم پر وحی کی جا رہی ہیں بالیقین میں ہی اللہ ہوں میرے سوا کوئی مستحق عبادت نہیں، پس میری ہی بندگی کرو) اسی طرح غار حرا میں سب سے پہلے جو الفاظ گونجے ان میں بھی یہی حقیقت جلوہ گر تھی:۔

اِقْرَأْ بِاسْمِ رَبِّکَ الَّذِیْ خَلَقَ — پڑھ اپنے رب کے نام سے جس نے تجھے پیدا کیا ہے

اور جب انبیاء کرام کو یہ حقیقت سب سے پہلے سمجھانے کی ضرورت محسوس ہوئی تو عام انسان کس شمار میں ہیں، وہ تو اور زیادہ اس کے محتاج تھے کہ ان کے کانوں میں سب سے پہلے یہی بات ڈالی جائے اور ان کے دلوں میں پہلے دن

اسی کی روح پھونکی جائے۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا اور بلا استثنا ہر نبی نے اپنی امت کو دعوت حق دینے کا آغاز اسی بات سے کیا کہ:۔

اُعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرُهٗ — اللہ کی بندگی کرو جس کے سوا تمہارا کوئی معبود حقیقی نہیں

ایمان باللہ کی اہمیت فراموشی

پس ہر اس شخص کے لیے جو دین حق کی اطاعت و اقامت کا فرض ادا کرنے کی سچی نیت رکھتا اور اس کے لیے عملاً سعی و جہد کا آغاز کرنے جا رہا ہو، اولین شرط یہ ہے کہ اپنے اندر ایمان باللہ کی روح کو پیدا یا بیدار کرے، اور اپنے نفس کو ہرگز اس امر کی اجازت نہ دے کہ وہ اپنی پر فریب تاویلوں اور سخن طرازیوں سے اس کے اندر رسوخ ایمان کا جھوٹا پندار پیدا کر دے اور اس طرح اس کو اس فکر و سعی سے غافل کر دے۔ اس زمانہ میں جب کہ گلی گلی ایسے مذہبی دربار قائم ہیں جہاں سے بالکل معمولی شرطوں پر ایمان صادق کی سندیں اور نجات اخروی کے "پرمٹ" بڑی دریا دلی سے تقسیم کیے جا رہے ہیں، ہمارے ذہنوں کا اس امر پر آمادہ ہونا سخت دشوار ہے کہ ہم مسلمان ہونے کے باوجود اپنے اندر ایمان باللہ کی روح کو پیدا اور بیدار کرنے کی کوشش کریں، کیونکہ ہم اس خوش گمانی میں مبتلا ہیں کہ ہمارے اندر تو (چشم بد دور) پہلے ہی سے، بلکہ ہمیشہ سے اسلام و ایمان موجود ہے، پھر ہم سے ایمان باللہ کا مطالبہ کیا معنی؟ مگر یہ ساری غلط اندیشیاں

021/20 N5

دراصل نتیجہ ہیں اس بات کا کہ ہم ایمان باللہ کی اس حقیقت سے بالکل اندھیرے میں
ہیں جس کا قرآن ہم سے مطالبہ کرتا ہے، اور ہم اس ایمان باللہ کو بھی جس سے آج
کے ہر کفر، ہر طاغوت، ہر ابوجہل، ہر قیصر اور ہر کسریٰ کی نہ صرف آشتی ہے بلکہ اس
کو ان سب کی "حفاظت اور سرپرستی" کا فخر بھی حاصل ہے، اسی ایمان باللہ کا ہم پلّہ یا
کم سے کم اسی کا ہم جنس سمجھتے ہیں جس کو دیکھ کر کبھی چشمِ باطل میں خون اتر آتا تھا۔ یہ
خوش گمانی بلکہ خود فریبی ایک وبائے عام کی طرح ہر چہار سمت پھیلی ہوئی ہے۔
اور کتنے ہی دماغوں کے قوائے فکر و بصیرت کو ماؤف کیے ہوئے ہے۔ اس
مہلک وبا سے بچاؤ کا صرف ایک ہی راستہ ہے، اور وہ یہ کہ ہم ایمان کی ترازو،
عقائد و کلام کی کتابوں کو بنانے کے بجائے کتاب و سنّت کو بنائیں، اور یہ معلوم
کرنے کے لیے کہ ایمان باللہ کا مطلب اور مقتضا کیا ہے، قرآن کے بیانات
سے رہنمائی حاصل کریں، اور اس بات کو کبھی نہ بھولیں کہ عقائد و کلام کی کتابوں
میں جس ایمان کی بحث ہے وہ صرف سیاسی ایمان ہے جو ایک اسلامی اسٹیٹ
سے یا کسی مسلم سوسائٹی سے ہمیں اپنے سیاسی اور شہری و معاشرتی حقوق تو
دلا سکتا ہے مگر اقامتِ دین کی راہ میں حائل ہونے والے مصائب کے طوفان
سے ہماری کشتی لازماً پار نہیں لگا سکتا۔ یہ توفیق اور قدرت تو اللہ تعالیٰ نے اس
ایمان کے لیے مخصوص کر رکھی ہے جو قرآن کی نگاہوں میں ایمان ہے۔ اب ہمارا
فرض ہے کہ ہم اس آئینہ میں جو قرآن و سنّت نے ایمان باللہ کے لوازم و مقتضیات

اور مومنین باللہ کی صفات و خصوصیات کی شکل میں ہمارے سامنے رکھا ہے اپنے ایمان کے خط و خال دیکھیں اور اپنی سیرت و کردار کے تمام پہلوؤں کا جائزہ لیں اگر کوئی نقص نظر آئے اور ہم اپنے کو وہ کچھ یا سب کچھ کرتے پائیں جو ایمان باللہ کی روح کے ساتھ کسی طرح میل نہیں کھاتا تو اس کو اس امر کی علامت سمجھیں کہ ایمان کی روح ہمارے اندر نہیں اُتری ہے، یا کم از کم اس روح پر غفلت اور پژمردگی چھائی ہوئی ہے۔ اس احساس کے بعد ہمارا دوسرا فرض یہ ہونا چاہیے کہ اپنے دل و دماغ کی ساری قوتوں کے ساتھ اس روح کو اپنے اندر اتارنے کی فکر کریں اور اس کو از سر نو بیدار کرنے کی سعی میں ڈوب جائیں۔

بیداری ایمان کی عملی تدابیر

اس فکر و سعی کے عملی طریقے کیا ہیں؟ یہ ایک نہایت اہم سوال ہے جس کا جواب ایک بندۂ مومن کا دل تو بڑی آسانی سے دے سکتا ہے مگر کسی زبان کے الفاظ اس کا تحمل شاید کیا یقیناً نہیں کر سکتے۔ تاہم قرآن اور سنّت کے مطالعہ سے اس سلسلہ میں ہمیں جو روشنی ملتی ہے اس کی رو سے ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ اس مقصودِ گرانمایہ کا حصول چند باتوں کا اہتمام اور التزام تو ضرور ہی چاہتا ہے:۔

(۱) حصول بصیرت کی سعی

سب سے پہلی اور بنیادی بات تو یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ پر محض رسمی، سمعی اور وراثتی طور پر ایمان رکھنے ہی کو کافی نہ سمجھنا چاہیے، یعنی صرف اس بنیاد پر خدا کی ذات و صفات

پر ایمان لانے کو موجب اطمینان نہ قرار دے لینا چاہیے کہ جن گودوں میں ہم نے آنکھیں کھولی ہیں اور جس ماحول میں ہماری پرورش ہوئی ہے، وہاں اللہ کو ایک کہا جاتا اور اس کو علم و قدرت، حکمت و حاکمیت، عدل و رحمت اور خلق و امر وغیرہ صفات سے متصف گردانا جاتا تھا اس لیے ہم بھی یہی کہتے اور مانتے ہیں۔ یہ تقلیدی ایمان وہ قوتِ محرکہ نہیں بن سکتا جو ہمارے سینوں کو جوشِ عمل سے معمور کر دے، اور جو راہِ حق سے روکنے والے مادّی علائق پر قینچی چلا دیا کرے، بلکہ ہمیں اپنی فکر و بصیرت سے کام لے کر اس ایمان کو پا لینے کی کوشش کرنی چاہیے جس میں اپنی ذاتی معرفت ہو، براہ راست یقین کی گہرائی ہو، سُنی ہوئی بیرونی شہادت نہیں بلکہ اپنی چشم دل کا گویا مشاہدہ سا ہو۔

یہ بصیرت، اور یہ یقین و معرفت حاصل کیسے ہوتی ہے؟ اس کے لیے بالعموم تین طریقے اختیار کیے جاتے ہیں۔ ایک طریقہ تو قرآن و سنت کا بتایا ہوا ہے جو مکمل اور خالص فطری ہے اور حقیقی فلاح کا ضامن۔ دوسرا عام ارباب تصوّر (الّا ماشاء اللہ) کا طریقہ ہے جو نامکمل بھی ہے اور حصول مقصد کے باب میں نا تشفی بخش بھی۔ تیسرا طریقہ فلسفہ کا ایجاد کردہ ہے جو نامکمل و ناقص ہی نہیں حد درجہ تباہ کن بھی ہے۔

جہاں تک فلسفہ اور اہل فلسفہ کی مساعی اور ان کے دعاوی کا تعلق ہے، عمل اور نتیجہ کے اعتبار سے وہ سخت ناقابل ستایش ہے۔ حق یہ ہے کہ اس

فلسفۂ یونان و عجم نے ایمان کے حصول میں نہ کبھی کوئی مدد دی ہے اور نہ آئندہ دے سکتا ہے، البتہ اس سے دور پھینک دینے میں بہت کچھ کارگر ہو سکتا ہے۔ درحقیقت یہ بھی ہماری دینی تاریخ کا ایک بڑا ہی المناک باب ہے کہ لوگوں نے عقائد و نظریات تو قرآن سے لیے، مگر ان کی صداقت پر دلائل مہیا کرنے کے لیے وہ یونانی تفلسف کے اس بیابان میں جا دوڑے جہاں شک و ریب اور تذبذب اور وساوس کی خار دار جھاڑیوں کے سوا کچھ نہ تھا۔ نہ جانے انہیں کس چیز نے اتنی موٹی سی بات نہ سمجھنے دی۔ کہ جس قرآن نے بنی نوع انسان کو ان حقائق و نظریات کی تعلیم دی ہے وہ خود ہی ان کے دلائل بھی پیش کرتا ہے اور اس کے دلائل ایسے ہیں جو فطرت کی عین صدا ہیں، اور وہی ان عقائد کے سلسلہ میں دماغ کو سکون اور قلب کو طمانیت بخش سکتے ہیں

دوسرے طریقے کی خامی یہ ہے کہ اس میں معرفت اور تعلق باللہ کے مقام اعلیٰ تک پہنچنے کی روش غلط اختیار کی جاتی ہے۔ ابتدائی زینوں کو تقریباً یوں ہی چھوڑ کر آخری زینے پر قدم رکھ دیا جاتا ہے، یعنی سارا زور جذبات کی انگیخت اور کیفیات باطن کی تحصیل پر صرف کر دیا جاتا ہے۔ جب کہ اس سے پہلے ضرورت اس امر کی بھی ہوتی ہے کہ عقل کو تسلیم اور یقین کو استحکام سے بہرہ ور کیا جائے پھر قوانین شرع سیکھے جائیں اور اپنی عملی ذمہ داریوں کو سمجھا جائے، بعد ازاں ان قوانین میں کام کرنے والی حکمتوں سے شناسائی بھی حاصل کی جائے۔ اس

غلطی کا سرچشمہ ان حضرات کا یہ غلط تصور ہے، خواہ شعوری طور پر یا غیر شعوری طور پر، کہ مذہب کا تعلق صرف دل سے ہے نہ کہ عقل و دماغ سے۔ حالانکہ باطنی طور پر دین و مذہب کے باب میں دل و دماغ کی یہ تفریق ایسی ہی غلط اور غیر قرآنی ہے جیسی کہ عالم ظاہر میں دین وسیاست کی تفریق۔ دراصل اسلام نے دین کا جو وسیع اور ہمہ گیر تصور پیش کیا ہے، اس کا دماغوں میں ٹھیک ٹھیک بیٹھنا اور مرتسم رہنا عملاً کچھ آسان نہیں، اگرچہ بالاجمال اس کا اقرار کرنے اور اس کی مدح و ثنا کرتے رہنے کی حد تک تو کسی کی زبان سست نہیں پڑتی، اور ہر شخص، خواہ وہ صوفی یا عالم یا سیاست دان کوئی بھی ہو، اس زبانی جمع خرچ میں سب سے آگے ہی رہنے کی کوشش کرتا ہے۔ مگر جب عمل کا وقت آتا ہے تو کہیں سیاست کو دین سے الگ اور آزاد کر لیا جاتا ہے، کہیں عقل اور دماغ کا رشتہ دین سے کاٹ دیا جاتا ہے اور قلب و روح ہی میں ساری وسعتِ دین سمیٹ لی جاتی ہے، کہیں فقہ کی جزئیات ہی کو پورا دین سمجھ لیا جاتا ہے۔ وہ دن اسلام کے حق میں انتہائی نامبارک دن تھا جس دن کہ تفریق و تقسیم کے یہ فتنے پیدا ہوئے۔ اس کی مثال بالکل ایسی تھی جیسے کسی کامل تندرست اور توانا جسم کے اعضا ایک دوسرے سے الگ کر لیے گئے ہوں، یا کسی منظم حکومت کے مرکزی شیرازہ کو ختم کر کے مختلف محکموں کو آزاد کر دیا گیا ہو، نہ صرف آزاد کر دیا گیا ہو، بلکہ بعض محکمے بلا وزیر یوں ہی چھوڑ دیے گئے ہوں، اور بعض غیر متعلق یا غیر مناسب مشاغل اس کے ساتھ لا کر جوڑ دیے گئے ہوں۔ فکر و عمل کا یہ انتشار

اپنی ایک مستقل تاریخ رکھتا ہے جس کی تفصیلات کے لیے ایک پورا دفتر درکار ہے۔ یہاں اس بحث کے جس جز کی طرف ہمیں اشارہ کرنا ہے، وہ صرف یہ ہے کہ ہمارے ارباب تصوف کی اکثریت اپنے اخلاص کے باوجود اس شدید غلط فہمی کا شکار رہی ہے کہ دین و خدا پرستی کا تمام تر تعلق صرف قلب و روح سے ہے عقل و دماغ سے اس کے ڈانڈے غالباً کہیں ملتے ہی نہیں۔ اسی بنائے فکر کا نتیجہ ہے کہ ان کی تعلیمی اور تربیتی مساعی کا سارا زور قلب اور اس کے احوال ہی پر صرف ہوتا رہا ہے، عقل اور اس کے وظائف کو وہ ایک خالص دنیوی شے سمجھتے ہیں اور اس کے سارے حقوق کو انہوں نے اہل دُنیا کے حوالہ کر رکھا ہے۔ ان کا خیال ہے کہ ذات باری کی معرفت میں عقل درماندہ محض ہے اور اس باب میں اس کی کوئی خاص ضرورت نہیں۔ لیکن کیا امر واقعہ یہی ہے؟ کیا یہ حقیقت نہیں ہے کہ قرآن عقل و تدبر ہی کو بنائے ایمان قرار دیتا ہے، اور اس قسم کے جملوں سے اس کے صفحے بھرے پڑے ہیں۔

.....فَاَخْرَجْنَا بِهٖٓ اَزْوَاجًا مِّنْ نَّبَاتٍ شَتّٰى كُلُوْا وَارْعَوْا اَنْعَامَكُمْ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّاُولِي النُّهٰى (طٰہٰ ۲۰)	........پھر اس (پانی) سے ہم نے مختلف اقسام کی نباتات اُگائیں (اور تم سے کہا کہ) خود کھاؤ اور اپنے مویشیوں کو بھی چراؤ۔ بلاشبہ اس کے اندر عقل والوں کے لیے (توحید باری پر) کھلی دلیلیں ہیں۔

الَّذِيْنَ يَسْتَمِعُوْنَ الْقَوْلَ فَيَتَّبِعُوْنَ اَحْسَنَهٗ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ هَدٰىهُمُ اللّٰهُ وَاُولٰٓئِكَ هُمْ اُولُوا الْاَلْبَابِ (زمر-۱)

جو باتوں کو غور سے سنتے اور ان میں جو بہتر ہوتی ہیں، ان ہی کی پیروی کرتے ہیں یہی وہ لوگ ہیں جنہیں اللہ نے ہدایت بخشی ہے اور یہی لوگ ہیں جو صاحب عقل ہیں۔

.... هَلْ فِيْ ذٰلِكَ قَسَمٌ لِّذِيْ حِجْرٍ (الفجر)

.... بلاشبہ اس کے اندر صاحب خرد کے لیے کھلی ہوئی شہادت موجود ہے۔

پھر اتنا ہی نہیں، بلکہ معاملہ تو اس سے بھی بہت آگے ہے۔ لوگوں کو یاد نہیں رہا کہ یہی عقل و دماغ ہی تو دعوت نبوی کے مخاطب اول تھے، اس لیے دین کے بارے میں ان کی اہمیت سے انکار در اصل اس امر کا اقرار ہے کہ خود مناصب نبوت کو نہیں سمجھا گیا۔ اس لیے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کا مقصد صرف احکام الٰہی کی تبلیغ ہی نہ تھا بلکہ کچھ اور بھی تھا:۔

لَقَدْ مَنَّ اللّٰهُ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ اِذْ بَعَثَ فِيْهِمْ رَسُوْلًا مِّنْ اَنْفُسِهِمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ وَيُزَكِّيْهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ۔

(آل عمران ۱۷۰)

یقیناً یہ اللہ تعالیٰ کا مومنوں پر بڑا احسان ہے کہ اس نے ان کے درمیان ایک ایسا رسول برپا کیا جو ان کو اس کی آیات سناتا ہے[۱]، ان کے نفسوں کو سنوارتا ہے[۲] اور انہیں کتاب (قوانین شرع) اور حکمت[۳] (روح شرع) کی تعلیم دیتا ہے۔

یہ آیت بتاتی ہے کہ رسولؐ کریم کے چار فرائض اور مناصب تھے، اور ان چاروں کی مجموعی سرانجام دہی منصب رسالت کی تکمیل کے لیے ضروری تھی۔ ان مناصب میں ایک خاص منطقی ترتیب تھی۔ آپ کا سب سے پہلا کام، یا تبلیغ رسالت کا سنگِ بنیاد تھا کہ "تلاوتِ آیات" کریں۔ تلاوتِ آیات کا مطلب صرف اتنا ہی نہیں ہے کہ آپ قرآن کی آیتیں پڑھ کر لوگوں کو سنا دیں، قرآن کا معمولی طالب علم بھی اس حقیقت سے بے خبر نہ ہوگا کہ آیت کے معنی قرآن میں ہر جگہ وہی نہیں ہوتے جو معنی کہ اس لفظ کے زبان اردو میں مشہور اور متداول ہیں۔ بلکہ اس کے ایک معنی شاہد اور دلیل کے بھی ہیں، اور قرآن مجید میں بکثرت مستعمل ہیں۔ چنانچہ اس موقع پر آیات سے مراد دلائل ہی ہیں، جیسا کہ آیت کے ان ٹکڑوں سے واضح ہوتا ہے جو یَتۡلُوۡا عَلَیۡہِمۡ اٰیٰتِہٖ کے بالمقابل لائے گئے ہیں۔ اس لیے "اللہ کی آیات سنانے" کا مطلب یہ ہے کہ پیغمبرؐ ان آفاقی اور انفسی دلائل سے، جو توحید و معاد وغیرہ مبادیِ دین پر قرآن دیتا رہتا ہے، لوگوں کے اندر ایمان کی حقیقتیں اتارتا ہے، اور جن کے دلوں میں یہ حقیقتیں اتر چکی ہیں، ان کے اندر انہیں اور زیادہ مستحکم، اور ان کے کیف و اثر کو تیز تر کرتا رہتا ہے۔ اس ابتدائی منزل کے بعد کہیں جا کر دوسری منزل کی طرف بڑھتا ہے اور تاسیس ایمان کے بعد ایمان کے تقاضے سامنے لاتا ہے۔ یعنی لوگوں کو اطاعتِ ربّ کی عملی شکلیں بتاتا اور انہیں ان کے فرماں روائے حقیقی کے احکام سکھاتا ہے، پھر تیسری (تعلیم حکمت کی) اور

چوتھی "تزکیہ نفوس" کی منزل آتی ہے، اور کارِ نبوت انجام پذیر ہوتا ہے جس طرح کسی عمارت کی بنیادیں بھرے بغیر دیواریں نہیں اٹھائی جاتیں اور نہ چھتیں پاٹی جاتی ہیں، ٹھیک اسی طرح کسی شخص کی عقل و فہم کو دلائل سے مطمئن کیے بغیر اس کے قلب کو ایمانی کیفیتوں سے لبریز کرنے کی سعی کوئی موزوں اور مکمل سعی نہیں ہے، جس کے اوپر پورے اطمینان کا اظہار کیا جا سکے، اور جس سے بہرحال ان ثمرات کی توقع وابستہ کی جا سکے جو قرآن کے بیان کردہ طریقِ تعلیم و تربیت سے ہی حاصل ہوتے ہیں۔ عموماً جو آپ یہ دیکھتے ہیں کہ اکثر و بیشتر اربابِ تصوف کے دینی کارناموں میں دینِ اسلام کے ایک جامع دستورِ حیات ہونے کے باوجود ایک محدودیت سی ہوتی ہے، اور مقتضیاتِ دین کے چند ہی گوشوں پر ان کے شوق اور توجہ کی نگاہ جم کر رہ جاتی ہے، وہ جس خدا کے ذکر و فکر میں ڈوبے دکھائی دیتے ہیں اسی کی مرضیات سے ان کے ہر چہار طرف علانیہ بغاوت ہو رہی ہوتی ہے مگر ان کے ذوقِ محبت پر ناگواری اور اضطراب کی کوئی موج محسوس نہیں ہوتی، اور وہ اپنے عقیدت مندوں کو صفائی قلب، جلائے باطن، اذکار اوراد، وظائف اور مراقبے کی تلقین کرنے میں ہر آن مصروف رہتے ہیں، مگر وسیع تر انسانی زندگی سے متعلق جو شرعی ہدایات اور احکام ہیں وہ ان کی اک نگاہ غلط انداز کے لیے بھی ترستے رہ جاتے ہیں، وقت کے ظالم اور جبار اپنی تمام غیر اسلامی بلکہ دشمنِ اسلام سرگرمیوں کے باوجود بسا اوقات ان کی دعاؤں کے مستحق ہوتے

اور ان کو اپنا سر چشمۂ سکون محسوس کرتے ہیں، جب کہ حقیقتاً انہیں ان کے لیے بجلی کا شرارہ ہونا چاہیے تھا — تو اس عجیب صورتِ حال کی وجہ اس کے سوا کچھ نہیں کہ عام دنیا داروں کی طرح ان لائقِ صد احترام دین داروں نے بھی دین اور اس کے متعلقات کے باب میں ہمہ گیر نظر سے کام نہیں لیا، انہوں نے عملاً اس کی جامعیت کو محدودیت سے، اور اس کے توازن کو عدم توازن سے بدل دیا۔ خدا کی محبت اور اس کے صریح تقاضوں میں، توحید اور اس کے کھلے ہوئے لوازم میں علیحدگی پیدا یا گوارا کر لی۔ قرآن نے "فواد" (قلب) کے ساتھ ساتھ، بلکہ اس سے بھی پہلے "سمع" اور "بصر" (ذرائع غور و فکر) کو بھی مخاطب بنایا تھا، مگر انہوں نے سمع و بصر کو اس سعادت سے محروم قرار دے دیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ایمان باللہ یعنی اساسِ دین کا سنگِ اولین، اس اساس کے تمام گوشوں کو محیط نہ ہو سکا بنیاد بھر تو گئی مگر اس طرح کہ اگر اس کا ایک حصّہ کنکریٹ سے پختہ کیا گیا، تو دوسرے میں صرف ریت بھر دینے کو کافی سمجھ لیا گیا۔

تیسرا طریقہ، جو حصولِ مقصد کا تنہا فطری اور کامل طریقہ ہے، وہ ہے جو قرآن حکیم اور اسوۂ رسول کا بتایا ہوا ہے اور جس کی عملی تفصیل کتاب و سنّت ہی کے اندر ہے۔ قرآن نے جب بھی امورِ غیب لوگوں کے سامنے رکھے اللہ تعالیٰ کی ذات و صفات پر ایمان لانے کو کہا، قیامت اور محاسبۂ اعمال پر یقین رکھنے کا مطالبہ کیا، تو اس کے لیے کبھی خالص تحکمی انداز نہیں اختیار کیا، اور نہ

ان سے یہ کہا کہ چونکہ میں ان باتوں کو پیش کرتا ہوں اس لیے آنکھیں بند کر کے انہیں مان لو۔ اس کے خلاف اس نے جس حقیقت غیبی کو بھی ایمان لانے کے لیے پیش کیا، اس پر فطرت کے واضح حقائق سے دلیلیں دیں، انسان کی اپنی ذات کے اندر چھپی ہوئی حقیقتوں سے شہادت دلوائی، اس پورے کارخانہ عالم کے نظام سے اس کی توثیق کرائی۔ پھر ان سے کہا، آنکھیں کھول کر دیکھو، یہ سارے آفاقی اور انفسی حقائق کس اصل کی طرف اشارہ کر رہے ہیں؟ کانوں کی گرانیاں دور کر کے غور سے سنو، یمین و یسار تم سے کیا کہہ رہے ہیں؟ اور جب بہتوں نے پھر بھی ایمان لانے سے انکار کیا تو اس نے یہ کہہ کر ان پر اظہار غضب و نفرت کیا کہ اُن کے دل ہیں مگر ان سے حقیقت بینی کا کام نہیں لیتے، ان کے آنکھیں ہیں مگر ان سے دیکھتے نہیں، ان کے کان ہیں مگر ان سے سنتے نہیں۔ پس یہ جانوروں جیسے ہیں، بلکہ ان سے بھی گمراہ تر۔ لَهُمْ قُلُوْبٌ لَّا يَفْقَهُوْنَ بِهَا وَلَهُمْ اَعْيُنٌ لَّا يُبْصِرُوْنَ بِهَا وَلَهُمْ اٰذَانٌ لَّا يَسْمَعُوْنَ بِهَا اُولٰٓئِكَ كَالْاَنْعَامِ بَلْ هُمْ اَضَلُّ (اعراف) اسی طرح انہیں اس نے بار بار اندھا اور بہرا ٹھہرایا، محض اس وجہ سے کہ وہ اپنی عقلی اور فکری قوتوں سے صحیح طور پر کام نہیں لیتے، اور ان کے روبرو توحید و معاد وغیرہ اساساتِ دین کی روشن سے روشن دلیلیں بیکار محض بن کر رہ جاتی ہیں۔ ان کے بالمقابل اس نے ان لوگوں کو، جن کا طرزِ عمل ان سے مختلف تھا، یہ کہہ کر خراج تحسین ادا کیا کہ:-

وَالَّذِیْنَ اِذَا ذُکِّرُوْا بِاٰیٰتِ رَبِّھِمْ لَمْ یَخِرُّوْا عَلَیْھَا صُمًّا وَّعُمْیَانًا (فرقان ۷۳)

اور یہ (خدا کے نیک بندے) وہ لوگ ہیں جو اپنے رب کی آیتوں پر، جب کہ انہیں ان آیتوں کے ذریعہ یاد دہانی کرائی جاتی ہے اندھے بہرے ہو کر ٹوٹ نہیں پڑتے (جیساکہ اہل کفر کا شیوہ ہے)

غرض، جہاں تک ایمان باللہ کے ایقانی پہلو کا تعلق ہے، اس کے حاصل یا بیدار کرنے کے لیے ضروری ہے کہ پہلے قرآن کے اس حصّہ پر جو یَتْلُوْا عَلَیْھِمْ آیَاتِہٖ کا حصّہ ہے، اور جس میں توحید اور دوسری صفات باری پر دلائل دیے گئے ہیں، خصوصیت سے نگاہ ڈالی جائے، اس طرح ڈالی جائے جس طرح کہ اس کا حق ہے، اس کے طرزِ استشہاد پر دل اور دماغ کی پوری یکسوئی کے ساتھ غور کیا جائے اور پیہم و لگاتار کیا جائے قرآن ہمیں اطمینان دلاتا ہے کہ اس غور و فکر کے نتیجہ میں ذہن کے اندر وہ روشنی پیدا ہو کر رہے گی، اور برابر بڑھتی چلی جائے گی جو ذات و صفات الٰہی کے بارے میں کسی جہل اور شک کی تاریکی کو باقی نہ رہنے دے گی۔ یہی فطری ترتیب بھی ہے اور صحیح تدبیر بھی۔ ضرورت ہے کہ علاج کی یہی فطری ترتیب اور صحیح تدبیر اختیار کی جائے، اور مضر یا ناقص علاج پر قوتیں صرف نہ کی جائیں۔

مگر مشکل یہ ہے کہ یہاں ایک اور ہی غلط فہمی سنگ راہ بنی ہوئی ہے۔ لوگ سمجھتے ہیں کہ قرآن کی وہ آیتیں تو، جن میں وحدانیت پر دلیلیں دی گئی

ہیں، انہیں سنانے کی ہیں جو مشرک ہیں، چنانچہ ایسی آیتیں سناتے وقت قرآن ان ہی کو مخاطب بھی کرتا ہے۔ کہ ہم کو جو پہلے ہی سے "توحید کی امانت" سینوں میں لیے بیٹھے ہیں، "ان دلائل سے کیا لینا ہے[1]؟ افسوس کہ جہل کے اس "نورانی حجاب" نے یُمن و سعادت کے کیسے کیسے بیش قیمت خزانے ہماری نگاہوں سے اوجھل کر رکھے ہیں۔ ہم اپنی متاعِ ایمان کی غور و پرداخت میں ایک جاہل کسان سے بھی زیادہ بودے ثابت ہوئے، جو کسانی کا فرض یہی نہیں سمجھتا کہ بس زمین کو ذرا نم کر کے اس میں دانہ ڈال دے، بلکہ ضروری سمجھتا ہے کہ اس بیج سے پودے کے نکلنے، اس کے زندہ و شاداب رہنے، اور بارآور ہونے کے لیے بار بار اسی پانی سے سیراب کرتا رہے جس سے تخم ریزی کے وقت اس نے زمین نم

---

[1] یہی تصور ہے جس نے قرآن کی تعلیم کو ہمارے دینی دار العلوموں میں وہ حیثیت بھی نہیں دلوائی جو صدہا برس کی مردہ منطق، اور فلسفہ کی تعلیم کو حاصل ہے، وہ فلسفہ جو ابھی تک زمین کو کسی قطب کی طرح ساکن ٹھیرائے ہوئے ہے۔ چنانچہ تعلیمِ قرآن کے بارے میں کھلم کھلا یہ بات کہی جاتی ہے کہ اس پر تو محض تبرک کے طور پر نظر ڈلوا دی جاتی ہے، ورنہ ائمہ نے اس کے سارے احکام نکال کر فقہ کی کتابوں میں مدون کر دیے ہیں۔ گویا فقہی احکام کے ماسوا جو کچھ ہے وہ ہمارے لیے نہیں ہے، بلکہ تیرہ سو برس پیشتر بسنے والے کفارِ عرب اور منافقینِ مدینہ اور اہلِ کتاب ہی کے سنانے کے لیے تھا۔ (ص)

کی تھی۔

ایمان جیسی شے اتنی کم ارزاں تو نہ تھی کہ اسے جو اور گندم کی کھیتوں سے بھی کم لائقِ اعتنا سمجھا جاتا۔ نہیں معلوم اس اجتہادِ فکر کی بنیاد قرآن کی کس آیت پر ہے کہ دلائل توحید پر مشتمل آیات کا تعلق صرف اہلِ شرک سے ہے؛ اس کے بخلاف ہم تو یہ دیکھتے ہیں کہ قرآن ان "مسلمانوں" کو بھی جو اپنے ادعائے ایمان پر اس کے عملی تقاضوں کی مناسب شہادتیں فراہم نہ کر سکے تھے، ایک طرف زجر و ملامت کرتا ہے، دوسری طرف انہیں توحید و معاد کی وہی دلیلیں سناتا ہے جو کھلے منکروں کو سنایا کرتا ہے (ملاحظہ ہو سورہ آلِ عمران، سورہ نور، سورہ حدید وغیرہ) یہ گویا اس بات کا فیصلہ ہے کہ قرآن ان کی عملی کوتاہیوں کا سرچشمہ ضعفِ ایمان کو قرار دیتا ہے، اور اس ضعفِ ایمان کا مطلب اس کے نزدیک یہ ہے کہ ان کے ذہنوں میں توحید و آخرت کا جو تصوّر ہے وہ اپنے استحکام کے لیے دلیل و برہان کا محتاج ہے، اسی لیے وہ ضرورت محسوس کرتا ہے کہ انہیں وہ دلائل سنائے جو ان اصولِ دین کو اچھی طرح مدلّل کر سکیں اور ان کے دماغوں کو ضعف و تردد کی تاریکیوں سے پاک کر کے یقین کی روشنی سے منوّر کر دیں۔ پھر اگر آج کے مدعیانِ اسلام کا اخلاق و عمل ویسے ہی ضعفِ ایمان اور اضمحلالِ یقین کی تشویش ناک اطلاعیں دے رہا ہو۔ اور کون ہے جو اس سے انکار کی جرأت کر سکتا ہے — تو ان کے اندر اس ایمان کو مستحکم اور

اس یقین کو بیدار کرنے کے لیے قرآن کے اختیار کردہ طریقے سے کیونکر بے توجہی برتی جاسکتی ہے؟ اور کسی کو حق کیا پہنچتا ہے کہ وہ اس کے مقابلہ میں اپنا کوئی اختراعی طریقہ پیش کرے؟

"ضعفِ ایمان" کا نام سن کر یہ دھوکا نہ کھانا چاہیے کہ ان دلائل پر غور و فکر کے ضرورت مند اگر اہلِ ایمان ہیں بھی تو زیادہ سے زیادہ صرف وہ "اہلِ ایمان" ہیں جو نفاق کے مریض ہوں، یا جن کے ایمان کمزور اور ناپختہ ہوں۔ رہے راست باز، مخلص اور پختہ یقین رکھنے والے مسلمان، تو ان کو ان کی حاجت بہر حال نہیں ہے۔ قرآن نے ایسی کوئی تفریق نہیں کی ہے۔ وہ بلا کسی امتیاز کے سارے ہی اہل ایمان کی یہ صفت بیان کرتا ہے کہ:۔

یَتَفَکَّرُوْنَ فِیْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ۔ (انعام ۱۹) — یہ لوگ آسمان و زمین کی پیدائش میں غور و فکر کیا کرتے ہیں۔

یہ غور و فکر کرتے کیوں ہیں؟ محض اس لیے کہ ان کے اندر صفاتِ باری کا علم و یقین مستحکم تر ہوتا چلا جائے اور اس خلقتِ کائنات کے پس پردہ کام کرنے والی حکمت و تدبیر کا مشاہدہ توحید الٰہی اور وقوعِ قیامت کو گویا ایک آنکھوں دیکھی حقیقت بناتا چلا جائے۔

اس حقیقت کا اگر مزید اطمینان درکار ہو تو اس آیت کریمہ کے الفاظ پر ایک بار پھر نظر ڈال لیجیے جس کا تذکرہ ابھی اوپر گذرا، یعنی:۔

لَقَدْ مَنَّ اللّٰهُ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ	یہ اللہ تعالیٰ کا مومنوں پر بڑا احسان ہے کہ
اِذْ بَعَثَ فِيْهِمْ رَسُوْلًا مِّنْ	اس نے ان میں، انہیں کے اندر سے ایک
اَنْفُسِهِمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيَاتِهٖ "الخ"	رسول برپا کیا جو انہیں اس کی آیات سناتا ہے،

ان لفظوں میں دو باتیں خاص طور سے لحاظ کے قابل ہیں، ایک تو یہ کہ ذکر اہل ایمان کا ہے، اور دوسری یہ کہ اہل ایمان سے متعلق جہاں رسول خدا کے اور فرائض و مناصب گنائے گئے ہیں، وہیں اس فرض اور منصب کا بھی ذکر کیا گیا ہے کہ آپ "ان مومنوں کو آیات الٰہی سناتے ہیں"۔ آیات سُنانے کا مطلب، جیسا کہ ہم اوپر بیان کر چکے ہیں، یہ ہے کہ آپ اُن کے سامنے وہ آیات قرآنیہ پیش کرتے رہتے ہیں جن میں توحید اور معاد کے اوپر آفاق و انفس کے مضبوط دلائل موجود ہیں۔ اب اصل صورتِ حال پر غور کیجئے۔ جس شے سے صدر اوّل کے مومنین قانتین بھی بے نیاز نہیں قرار دیئے گئے، اور جن کے سلسلے میں رسول کا یہ ایک بنیادی فرض ٹھہرایا گیا کہ وہ ان کے سینوں میں لگے ہوئے ایمانی پودے کی دلائلِ فطرت سے برابر آبیاری کرتے رہیں، اس سے آج کا مسلمان بے نیاز کیونکر ہو سکتا ہے؟ کیا ہمارا ایمان صحابہؓ کے ایمان سے بھی زیادہ مضبوط اور گہرا ہے؟ اگر ایسا نہیں ہے، اور یقیناً نہیں ہے، تو یہ کتنی بڑی نادانی اور خود فریبی ہے کہ ہم اپنے آپ کو قرآن کے استدلالی مباحث سے بے نیاز قرار دے لیں! لیکن بدقسمتی سے یہ غلط اندیشی آج ایک وبائے عام کی طرح ہر سمت پھیلی ہوئی ہے ضرورت ہے کہ اب

ہم اس خود فریبی اور نادانی کے چکّر سے نکل آئیں، اور اس پندارِ باطل سے اپنے ذہنوں کو پاک کر لیں کہ جب ہم زمرۂ مومنین میں شامل ہیں تو توحید کے رموز و نکات اور اس کے دلائل و شواہد کی جستجو میں اپنی قوتیں صرف کرنے کی ہمیں کیا حاجت ہے؛ کیونکہ اس کے بغیر بھی ہم اپنے اندر تصوّرِ توحید کو اعمالِ صالحہ کی اصل قوتِ محرکہ کی حیثیت سے برابر زندہ رکھ سکتے ہیں۔ یہ غلط فہمی ایک بڑی مضرت رساں غلط فہمی ہے۔ اس کے برخلاف ہمیں معلوم ہونا چاہیے کہ قرآن کی وہ آیات جن میں توحیدِ الٰہی پر دلیلیں دی گئی ہیں، براہِ راست ہمارے قوائے فکر و تدبر کو بھی خطاب کرتی ہیں۔ ہمارا فرض ہے کہ ہم اس خطاب کا ٹھیک ٹھیک خیر مقدم کریں، اور اپنی احتیاج سمجھ کر کریں، ان میں ہمارے ایمان کی زیادتی، یقین کی پختگی اور بصیرت کی روشنی کا غیر محدود مواد ودیعت کیا گیا ہے۔ ہم سخت بدقسمت ہوں گے اگر اس مواد سے یہ کہہ کر محروم ہو جائیں کہ ان آیات کا تعلق کفّار سے تھا، فلاں فلاں آیتیں منافقین کے حق میں نازل ہوئی تھیں، قرآن کا اتنا حصہ مشرکوں سے بحث کرتا ہے، اب اگر ہم ان آیتوں اور قرآن کے اس حصّہ کو پڑھتے ہیں تو صرف برکتِ تلاوت کے لیے۔

(۲) لوازمِ صفات کا تفصیلی علم اس کے بعد دوسری منزل صفاتِ باری کے لوازم خصوصاً لوازمِ توحید سے پوری آگہی حاصل کرنے کی منزل ہے۔ انسان ہرگز اس قابل نہیں کہ اللہ کی ذات و

صفات کا اجمالی یقین حاصل کر لینے کے بعد خود ہی ان صفات کے تفصیلی تقاضوں کا ٹھیک ٹھیک اندازہ بھی لگالے۔ یہ امر اس کے لیے قطعی محال ہے۔ اگر ایسا ممکن ہوتا تو انبیاء کے بھیجنے اور شرائع کے نازل کیے جانے کی سرے سے کوئی ضرورت ہی نہ تھی۔ اس لیے خواہ ذات وصفات کا مجمل علم کتنا ہی گہرا اور مبنی بر بصیرت کیوں نہ ہو، وہ بطورِ خود ان کے لوازم کو اپنی گرفت میں نہیں لے سکتا حالانکہ اسی پر رضائے مولا کی پیروی منحصر ہے۔ اس لیے ہر اس شخص کے لیے جو فی الواقع اللہ کی بندگی کا حق ادا کرنا چاہتا ہو، اس کی کتاب اور اس کے رسول کی سنت کی طرف رجوع کیے بغیر چارہ نہیں۔ یہ کتاب وسنت دراصل لوازم صفات ہی کا دوسرا نام ہیں لہٰذا ان کا مکمل علم حاصل کئے بغیر لوازم صفات کی معرفت کا حق ادا نہیں ہو سکتا، اور جب لوازم صفات کی معرفت کا حق ادا نہ ہو تو ذاتِ باری کے باب میں بصیرت اور معرفت کا دعویٰ ایک معصوم خوش فہمی کے سوا کچھ نہیں۔

ساری صفات الٰہی میں صفت توحید ایک خاص اہمیّت رکھتی ہے، اور دین وخدا پرستی کے تصوّر کی درستی بڑی حد تک اسی پر منحصر ہے۔ اس لیے وہ خاص توجہ کی مستحق ہے۔ ضرورت ہے کہ اس کے لوازم کا گہری نظر سے جائزہ لیا جائے اور پوری یکسوئی کے ساتھ اس کے مقتضیات کا تفصیلی علم حاصل کیا جائے۔ یاد رکھنا چاہیے کہ اس صفت کے لوازم کی حدیں بہت دور تک پھیلی ہوئی ہیں۔ زندگی کے کسی گوشہ پر نظر دوڑایئے، ممکن نہیں کہ اس میں اللہ کی توحید اپنے

کچھ مطالبے نہ رکھتی ہو۔ اور مطالبے بھی ایسے جن میں ہم اپنی پسند سے کوئی تفریق نہیں کر سکتے، نہ اپنے ذوق کو دخل دے سکتے ہیں۔ آپ چاہیں تو ان میں اولیت اور غیر اولیت کا اور قریب و بعید کا فرق کر لیجیے مگر اس فرق کا مطلب یہ ہرگز نہیں ہو سکتا کہ ان مطالبات میں سے کچھ ہمیشہ کے لیے (یا کچھ دیر کے لیے ہی سہی) بھلا دینے کے قابل ہیں، اور اگر یاد بھی ہوں تو اس طرح کہ ہماری فکری و عملی روش پر ان کا کوئی اثر نہ پڑے۔ آپ نے تو ان لوگوں کو بھی ان مقتضیات توحید میں اپنا اختیار تمیزی پوری بے دردی کے ساتھ استعمال کرتے ہوئے نہ دیکھا ہو گا جو ان کا علم بھی رکھتے ہیں، پھر اس شخص کے بارے میں آپ کیا خیال کر سکتے ہیں جس کو یہ نام نہاد علم بھی نہ ہو! ایسا شخص اگر ذکر و فکر کی کثرت سے ذاتِ الٰہی کی معرفت حاصل بھی کر لے اور اس کی محبت کا سوز بھی محسوس کرنے لگے تو بھی اس کے لیے مرضیات الٰہی کی پیروی بسا دشوار ہے۔ اس کا حال اس نادان خادم کا سا ہو گا جو اپنے آقا پر جان چھڑکنے کے لیے تیار تو ہو مگر نہیں جانتا کہ اسے خوش کس طرح کیا جا سکتا ہے اور اس کی رضا کس طرزِ عمل میں ہے؛ اس لیے کچھ بعید نہیں اگر وہ ایسی حرکتیں بھی کرتا رہے جو اس کے آقا کے نزدیک سخت ناپسندیدہ ہوں۔

(۳) ذکر دائمی علمی اور عملی طور پر اللہ تعالیٰ کی ذات و صفات اور لوازم صفات کی صحیح معرفت پیدا کرنے کی یہ کوششیں بیداری ایمان کی محض ابتدائی تدبیریں ہیں، اس لیے ان کے بعد اطمینان کی نیند نہ سو جانا چاہیے۔ ہم

بالعموم علوم وفنون کے نکتے حل کر لینے کے بعد ان کو اپنی کتاب معلومات کی زینت بنا کر حفاظت سے رکھ چھوڑتے ہیں، اور یہ سمجھ کر ایسا کرتے ہیں کہ ان نکات کے بارے میں ہم پر غور وفکر کی جو ذمہ داری تھی وہ ہم نے پوری کر لی ہے، اور اب ہمارا ذہن دوسرے مسائل کے لیے فارغ اور یکسو ہو چکا ہے۔ دوسرے حقائق اور نکات کی حد تک تو بلاشبہ یہ بات سو فی صدی صحیح کہی جا سکتی ہے، مگر ذات باری کی ہستی اور اس کی وحدانیت کا علم اس طرح کا کوئی نکتہ نہیں ہے جس کے پا لینے کے بعد ذہن کو بے فکر، فارغ اور یکسو سمجھ لیا جائے۔ یہ نکتہ دنیا کا عجیب ترین نکتہ ہے وہ انسان کے ذہن کو فارغ اور یک سو نہیں ہونے دیتا بلکہ فارغ اور یک سو کر لیتا ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ اسے پا لینے کے بعد اس سے بے نیازی نہ برتی جائے بلکہ دنیا کی ساری نیازمندیوں کے بندھن کاٹ کر اسی کا ہو رہا جائے، اور اسی کو فکر و ذکر کا مرکز بنا لیا جائے، وہ ایک مجسم حقیقت کی شکل میں ہر وقت نگاہوں کے سامنے رہے، ہم کسی حال میں اور کسی جگہ ہوں، اس کی یاد سے محروم نہ رہیں، اور جہاں تک ہو سکے کوشش کریں کہ یہ نکتہ ہماری یادداشت کو اپنی کامل گرفت میں لے لے۔ ہم جدھر بھی نگاہ اٹھائیں، دائیں، بائیں، آگے، پیچھے، یہاں تک کہ خالی فضاؤں میں بھی ہمیں یہ حقیقت منقوش نظر آئے۔ یعنی جس طرح ایک پیاسا پیاس کی شدت میں اپنے گرد و پیش کی ہر موجود شے سے غافل ہو جاتا ہے مگر پانی کی یاد سے، جو فی الواقع اس کے سامنے موجود بھی نہیں ہوتا،

غافل نہیں ہو سکتا، اسی طرح ایک مومن کے قلب و دماغ کو چاہیے کہ سب کچھ بھول جائے مگر خدا کو کبھی نہ بھولے یہی راز ہے جس کی بنا پر ایمان باللہ کے سب سے بڑے رمز شناس نے فرمایا ہے کہ :-

أَفْضَلُ الذِّكْرِ لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ — سب سے افضل ذکر لا الٰہ الا اللہ کا ورد ہے

اور اسی بنا پر اس نے اپنے پیروؤں کو حکم دیا ہے کہ :-

جَدِّدُوا إِيمَانَكُمْ بِقَوْلِ لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ — تم "لا الٰہ الا اللہ" کے ذکر پیہم سے اپنے ایمان کو تازہ کرتے رہو۔

اس لیے علمی اور عقلی طور سے اللہ تعالیٰ کی معرفت حاصل کرنے کے بعد دوسرا ضروری کام یہ ہے کہ زبان سے بالعموم، اور دل و دماغ سے حتی الامکان ہر آن اس کا ذکر کیا جائے۔ مگر یاد رہے کہ "ذکر" کا مطلب ذکر کے وہ خود ساختہ اور مصنوعی طریقے نہیں ہیں جو آج کل بالعموم رائج ہیں، بلکہ یہ ذکر فکر کے ساتھ ہونا چاہیے، اور شارع علیہ السلام کا اسوہ اس معاملہ میں ہماری رہنمائی کے لیے کافی ہے۔ اس مسئلہ پر ہم تفصیلی گفتگو کتاب کے چوتھے باب "نماز" میں کریں گے۔

(۳) محبتِ الٰہی

اللہ تعالیٰ کی ذات و صفات کا غور و تدبر کے ساتھ صحیح علم حاصل کر لینے اور اس "علم" کو ہر وقت ذہن میں مستحضر رکھنے سے بھی ایمان باللہ کا پورا حق ادا نہیں ہو سکتا۔ اس کے لیے ابھی ایک منزل اور

طے کرنی باقی ہے، اس منزل کا نام ہے اللہ تعالیٰ کی محبت اور اس کی رضا میں اپنی رضا کا گم کر دینا۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ ہمارے علم اور ہمارے حافظہ پر تصور توحید کی گرفت اگر قائم بھی ہو گئی تو یہ ایمان باللہ کے کامل تحقق کے لیے ہرگز کافی نہیں، بلکہ ضرورت ہے کہ ہم اپنے جذبات کو بھی اسی تصور کی گرفت میں دے دیں، اور جس طرح وہ ہمارے حواس علم و حافظہ پر چھایا ہوا ہے اسی طرح اپنے احوال قلب پر بھی اسے چھا جانے دیں۔ ورنہ اس کے بغیر ہمارا ایمان محض اک لاشۂ نیم جاں ہوگا، جو اس غایتِ مقصود تک ہمیں کبھی نہیں پہنچا سکتا جس کا نام قیام دین ہے۔ جذبات کو غلامی میں دیے بغیر معبود حقیقی کی کامل اطاعت نہیں ہو سکتی اور ہرگز نہیں ہو سکتی۔ چنانچہ مومن کی علامت ہی یہ ٹھیرائی گئی ہے کہ وہ ہر شے سے زیادہ اللہ سے محبت کرتا ہے۔ (وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰهِ) اور یہ کہ وہ اپنی خواہشوں، اپنے ولولوں اور اپنے فیصلوں کو مرضی الٰہی کے تابع کر دیتا ہے، (رَضُوْا عَنْهُ) اللہ تعالیٰ علانیہ فرماتا ہے کہ مجھے نرے توحید کے عقلی نکتے بیان کرنے والوں، اور صرف علم و نظریہ کی حد تک وحدانیت کے قائل فلسفیوں کی ضرورت نہیں ہے۔ مجھے ایسے بندے چاہئیں جو مجھ سے محبت رکھتے ہوں اور جو میری مرضی میں اپنی رضا کو گم کیے ہوئے ہوں:۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَنْ	اے ایمان لانے والو! تم میں سے جو کوئی
يَّرْتَدَّ مِنْكُمْ عَنْ دِيْنِهٖ	اپنے دین سے پھر جائے گا (اللہ کو اس کی

فَسَوْفَ يَأْتِي اللّٰهُ بِقَوْمٍ يُّحِبُّهُمْ وَيُحِبُّوْنَهٗ — کوئی پرواہ ہوگی پھر تمہاری جگہ اللہ کسی اور قوم کو لائے گا جو اس کی محبوب ہوگی اور جو اس سے محبت کرے گی۔

پس اس غلط فہمی میں کسی کو نہ پڑنا چاہیے کہ جس طرح ایک کمیونسٹ مارکس کے پیش کیے ہوئے نظامِ زندگی کو، اور ایک نیشنل سوشلسٹ ہٹلر کے بنائے ہوئے دستور کو، اور ایک ہندوستانی وطن پرست گاندھی جی اور جواہر لال کے تیار کیے ہوئے فلسفۂ حیات کو عقلاً صحیح سمجھ کر ان کی پیروی کر سکتا ہے، بغیر اس کے کہ اس کو ان مقتداؤں کی شخصیت سے کوئی محبت اور شیفتگی بھی ہو، اسی طرح اللہ تعالیٰ کے دیئے ہوئے احکام پر بھی عمل کر سکتا ہے۔ یہ ایک ایسی غلط فہمی ہے جس کی بنیاد سراسر سادہ لوحی اور حقیقت ناشناسی پر ہے، اور یہ نتیجہ ہے خدا پرستی کی راہ میں پیش آنے والی غیر معمولی مشکلات سے عملی ناواقفیت کا۔ لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ جب اسلام ایک بہترین نظامِ زندگی ہے، جو زندگی کی ساری الجھنوں کو بکمال حسن و خوبی سلجھا کر رکھ دیتا ہے تو اس کی افادیت کا قائل اور اس کی حقانیت کا معترف بھی اس کے لیے ٹھیک ان ہی شرائط کے تحت اور اتنے ہی قلبی تعلق کے ساتھ کامیاب تگ و دو کر سکتا ہے جتنے تعلق کے ساتھ دوسرے نظام ہائے زندگی کے پیرو اپنے اپنے پسندیدہ نظامِ حیات کی خاطر کیا کرتے ہیں، بلاشبہ یہ بات بالکل صحیح ہے کہ اسلام ایک مکمل ضابطۂ زندگی ہے، اور از روئے عقل

و تجربہ وہی ایک ایسا نظام ہے جو فطرتِ انسانی کے تقاضوں سے ہم آہنگ ہے
اور جو دُنیا کے امن و فلاح کا ضامن بن سکتا ہے، لیکن یہ کسی طرح صحیح نہیں ہے
کہ اس کی پیروی اور اطاعت کے لیے صرف اتنا ہی تعلق خاطر کفایت کر سکتا ہے
جتنا کہ دوسرے نظام ہائے حیات کے باب میں کفایت کیا کرتا ہے۔ اس کی
وجہ یہ ہے کہ اگرچہ موانع اور مصائب ہر نظام کے اجراءُ اقامت کی راہ میں
پیش آتے ہیں مگر اقامتِ دینِ حق کی راہ میں پیش آنے والے موانع کا حال بالکل
دگرگوں ہوتا ہے۔ قربانیاں دوسرے نظام بھی مانگتے ہیں، مگر زیادہ سے زیادہ
صرف جان، مال اور عیش و آرام کی۔ جذباتِ نفس کی کامل قربانی ان کے مطالبات
کی فہرست سے بالیقین خارج ہے۔ نہ صرف یہ کہ خارج ہے بلکہ شعوری یا غیر
شعوری طور پر الٹا اس کے علم برداروں کی تسکین نفس کا سامان بھی فراہم ہوتا
رہتا ہے۔ انسان مصائب میں گھر جاتا ہے، اس کی جائداد ضبط ہو جاتی ہے،
اس کا گھر ضبط ہو جاتا ہے، وہ قید بامشقت کی جانگداز سختیاں برداشت
کرتے کرتے گھبرا اٹھتا ہے، اور بسا اوقات موت کے تاریک سائے اس پر
چھانے لگتے ہیں، مگر ان سب کے باوجود کہیں ناموری کی خواہش، کہیں اقتدار
کی امید، کہیں عوامی مقبولیت کی اُمنگ، اور کہیں دوسرے مرغوباتِ نفس اس
کے زخمی دل پر ہر آن مرہم رکھنے کے لیے تیار رہتے ہیں، ایسا مرہم، جس کی
ٹھنڈک مصائب کو مصائب نہیں رہنے دیتی، اور اس کی رگوں میں ایک

نئے جوش عمل کی حرارت پیدا کرتی رہتی ہے۔ مگر یہ راہِ خدا پرستی تو سب سے پہلے جذباتِ نفس ہی کی قربانی کا مطالبہ کرتی ہے۔ وہ کہتی ہے کہ دوسری چیزوں کی قربانیوں کا موقع بعد میں آتا رہے گا۔ سب سے پہلے اس شے کو لاکر بھینٹ چڑھاؤ تمہیں نہ صرف جانیں کھپانی اور اپنی دولتیں نثار کرنی ہیں۔ بلکہ برائیوں کو بھلائیوں سے دُور کرنا ہے، گالیاں سُن کر دعائیں دینا ہے، دشمن دلوں کو اخلاص و مودت سے مسخر کرنا ہے، اللہ اور اس کے بندوں کے حقوق کو بہر حال ادا کرنا ہے، معاملات میں بے لاگ حق پرستی کی راہ چلنا ہے اور بتقاضائے حق اپنے اعزہ کے خلاف اپنے ماں باپ کے خلاف حتیٰ کہ خود اپنے خلاف کھڑا ہونا ہے، زندگی کے آخری لمحوں تک دین حق کی اطاعت واقامت کی ہمہ وقتی سرگرمیوں میں مصروف رہنا ہے — اور پھر یہ کہ یہ سب کچھ بغیر کسی دنیوی اجر و مفاد کی ہوس کے کرنا ہے، شہرت کی تمناؤں سے، دولت واقتدار کی امیدوں اور خواہشوں سے، تحسین وآفرین کی آرزوؤں سے، قائدانہ مقبولیت کی امنگوں سے، غرض ہر اُس شے سے دل ودماغ کو پاک رکھ کر کرنا ہے جو نفس انسانی کو مرغوب ہو سکتی ہے۔ غور فرمائیے، جس وقت انسان جرم خدا پرستی کی بنا پر مشکلات اور مصائب کے نرغہ میں ہوگا، اس وقت اس کے بیٹھتے ہوئے قلب کو سہارا کہاں سے نصیب ہوگا؟ ہر دنیوی رغبت تو اس پر حرام ہے۔ اگر آپ کا حسن ظن یہ ہے کہ ایسے دشوار مواقع میں ایک کمیونسٹ اپنی راہ پر صرف اس لیے جما رہتا ہے کہ اس کو مارکسزم کی سچائی اور معقولیت کا یقین ہے

تو آپ کو حق ہے کہ ایک مومن کے بارے میں بھی یہی حسن ظن قائم کر لیں اور سمجھ بیٹھیں کہ وہ بھی مصائب کے سمندر کو تیر کر ساحل مراد تک پہنچ سکتا ہے، صرف اس علم و اعتراف کے بل پر کہ اسلام ایک مکمل اور صحیح نظام زندگی ہے اور اس خدا کا مرتب کیا ہوا اور بھیجا ہوا ہے جس کے سوا کوئی حاکم و آقا نہیں۔ لیکن اگر آپ کے پاس اس متاع حسن ظن کی اتنی فراوانی نہیں ہے ---- جیسا کہ مجھے توقع ہے ---- تو پھر سوچئے قلب مومن کے سہارے کا سرچشمہ کہاں ہے؟ نقل (قرآن) کا جواب اوپر گذر چکا، عقل کا بھی کہنا یہی ہے کہ یہ سرچشمہ صرف ذات الٰہی کی محبت ہے۔ کسی حقیقت کا مجرد علم و اعتراف مشکلوں سے شکست کھا سکتا ہے، اور روزانہ کھاتا ہی رہتا ہے، مگر محبت نے یہ ننگ کبھی گوارا نہیں کیا ہے۔ اس لیے مومن کا ایمان اگر علم و اعتراف کی حدوں سے آگے نہیں بڑھا ہے تو مشکلات کے موقع پر یا تو اس کا نفس کسی مرغوب شے کی رشوت کا طالب ہوگا، یا اس رشوت کے نہ ملنے کی صورت میں وہ مصلحتیں تراش کر فرار کی راہیں ڈھونڈھے گا۔ اس سے ہرگز یہ توقع نہیں کی جاسکتی کہ وہ اپنے سابق فیصلے اور ایمان کے تقاضوں پر جما رہے گا اور ہر حال میں اپنی منزل مقصود کی سمت پیش قدمی کرتا رہے گا۔ لیکن اگر یہ علم و اعتراف محبت کا رنگ اختیار کر چکا ہے تو نہ وہ رشوت چاہے گا، نہ مصلحت ڈھونڈھے گا، نہ شکست تسلیم کرے گا۔ اگر کوئی دنیوی لالچ اس کی تسکین باطن کا سامان نہیں فراہم کرتا، تو نہ سہی، اس نے کب اس کے آسرے اس سعی و جہد

کا آغاز کیا تھا؟ وہ تو یہ مساعی اس لیے انجام دے رہا ہے کہ اس کے محبوب آقا و مولا کی مرضی یہی ہے، اس میں اسی کی خوشی ہے۔ اور کسی محبوب حقیقی کی خوشنودی مزاج سے بڑھ کر اور کیا صلہ، یا تسکین باطن کا اور کیا سامان ہو سکتا ہے جس کی ضرورت کا احساس یا جس کی تمنا کی جائے!

غرض اس خام خیالی کے لیے عقلی یا نقلی کوئی دلیل موجود نہیں کہ محض بطور ایک سیاسی فارمولے کے اللہ تعالیٰ پر یا اس کے دیے ہوئے مسلک حیات پر ایمان لا دینا یہ معنی بھی رکھتا ہے کہ اس مسلکِ حیات پر عمل کرنا اور اس کے تقاضوں کو پورا کرنا اب ممکن ہو گیا ہے۔ یہ امکان تو صرف وہ محبت پیدا کر سکتی ہے جو ایک سچے مومن کو اس مسلک حیات کے اصل واضع، اور اس کی تبعیت میں اس کے بھیجے ہوئے نمایندے سے ہوتی ہے، اس لیے جب تک ایمان باللہ علم و نظریہ کی حد سے آگے بڑھ کر ذوق و وجدان اور جذبات و میلانات تک میں نہ سرایت کر جائے اس راہ کے مسافر کو اپنی کمر نہیں کھولنی چاہیے، ورنہ وہ اپنی منزل تک ہرگز نہ پہنچ پائے گا۔ ایمان کا یہ بڑا ہی معمولی درجہ ہے کہ آدمی اللہ اور اس کے رسول کے احکام کے آگے سر تسلیم خم کر دے۔ اور ایمان کا اونچا اور قابل ستایش مقام یہ ہے کہ ان احکام کے خلاف دل کے گوشوں میں کسی ناگواری کی کھٹک بھی نہ ہو۔ ثُمَّ لَا یَجِدُوْا فِیْٓ اَنْفُسِهِمْ حَرَجًا مِّمَّا قَضَیْتَ۔ اور یہ آپ جانتے ہی ہیں کہ دل میں یہ کیفیت صرف علم و یقین کی بنیاد پر نہیں پیدا ہو سکتی، یہ تو کچھ محبت ہی کے بس

کی چیز ہے۔

محبت کوئی ایسی چیز نہیں ہے جو دیکھی اور دکھائی جا سکے، نہ صرف دعویٰ سے وہ پیدا ہو جاتی ہے، نہ ہی کچھ خاص قسم کی حرکات وکیفیات اس کے وجود کی دلیل ہیں۔ وہ اگر جانی اور مانی جا سکتی ہے تو صرف ایک طریقے سے، اور وہ ہے محبوب کی مرضیات کی والہانہ پیروی، اس کے اشارات چشم وابرو پر مضطربانہ تگ ودو اور اس کے احکام وفرامین کی خوش دلانہ اطاعت۔ اس لیے محبت کے باب میں دھوکا نہ کھانا چاہیے، اور اس کے لیے جو یہی ایک کسوٹی ہے، اس پر اسے برابر پرکھتے رہنا چاہیے۔ غیر اللہ کی محبت میں چاہے جو غیر معقولیت بھی برداشت کی جاتی ہو، مگر اللہ کی محبت، جو در اصل عقلی محبت ہے نہ کہ طبعی، کوئی غیر معقولیت گوارا نہیں کرتی، یعنی اسے یہ گوارا نہیں ہے کہ انسان محبت الٰہی میں اپنے ذوق کو دخل دے اور اپنی پسند کیمطابق محبت کرے۔ وہ قطعاً اس ذوق اور انتخاب کی آزادی نہیں دیتی۔ اس لیے اس جوش محبت میں ہوش کا دامن ہرگز نہ چھوڑنا چاہیے، ورنہ اندیشہ ہے کہ فریب کو محبت سمجھ لیا جائے گا جس کے فتنے ہر سُو عام ہیں۔

اس جگہ پھر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ایمان باللہ علم ویقین سے آگے بڑھ کر محبت کے مقام پر کس طرح پہنچتا ہے؟ اور دماغ کا اعتراف خشک، دل کے سوز میں کیوں کر تبدیل ہوتا ہے؟ تو اس باب میں جو چیز اصل وبنیاد کی حیثیت رکھتی ہے وہ اللہ تعالیٰ کی صفت رحمت کا بیش از بیش تذکرہ ہے۔

ویسے اس کی دوسری صفات کی یاد بھی بڑے فوائد بخشتی ہے، مگر اس کی حیثیت تائید واعانت کی سی ہے۔ لہٰذا ضرورت ہے کہ اس کی بے پایاں رحمتوں بخششوں اور نعمتوں کا بار بار تذکرہ کیا جائے۔ اس تذکرہ کی چند صورتیں ہیں۔ ایک[۱] تو یہ کہ اس کی مہربانیوں کے ہر سو پھیلے ہوئے مظاہر پر جب نگاہیں پڑیں، تو بے حسی کے ساتھ نہ پڑیں بلکہ حقیقت طلبی اور عبرت پذیری کے ذوق کے ساتھ پڑیں، تاکہ جب لوٹیں تو شکر و امتنان کی ٹھنڈک لے کر لوٹیں، اور دل کو منعم حقیقی کی عظمت و عقیدت سے بھر دیں۔ دوسری[۲] یہ کہ قرآن کی ان آیتوں کی تدبر اور حضور قلب کے ساتھ بار بار تلاوت کی جائے جن میں اللہ تعالیٰ نے اپنی رحمت کے مختلف پہلوؤں کا ذکر کیا ہے۔ تیسری[۳] یہ کہ اللہ تعالیٰ کی بخشی ہوئی نعمتوں سے استفادہ کرتے وقت دل کی گہرائیوں سے اس کا شکر ادا کیا جائے، جس کا طریقہ نبی کریمؐ کے اعمال و اذکار ماثورہ سے اخذ کیا گیا ہو، چوتھی[۴] یہ کہ اپنے فقر کا شدید احساس رکھا جائے اور ہر ضرورت کے وقت اللہ تعالیٰ ہی کے حضور اپنی التجائیں پیش کی جائیں۔ پانچویں[۵] یہ کہ اللہ تعالیٰ کو کثرت سے یاد کیا جائے، کیونکہ کسی چیز کی کثرت یاد ایک طرف اس کی محبت کا ثبوت بھی ہے۔ دوسری طرف اس کی محبت کے بڑھتے رہنے کا سبب بھی۔ یاد الٰہی کی مکمل ترین شکل نماز ہے۔ نماز کو جن وجوہ کی بنا پر بنیادی اساسات دین میں شامل کیا گیا ہے ان میں سے ایک خاص اور اہم وجہ یہ بھی ہے لیکن اس مسئلہ پر مفصل گفتگو اپنے مقام پر آئے گی۔

باب سوم

الایمان بالآخرۃ

اساس دین کا دوسرا بنیادی پتھر ایمان بالآخرۃ ہے، یعنی ایک ایسے روزِ جزا کے آنے پر کامل یقین جس میں اعمال انسانی کا خالص اخلاقی نقطہ نگاہ سے جائزہ لیا جائے گا، جب اللہ تعالیٰ کا دست عدل و حکمت آگے بڑھے گا، اور بڑھ کر ہمارے شعور و کردار کے چہرے سے اس دارالعمل میں کام کرنے والے قوانین طبیعی کی نقاب الٹ دے گا۔ جس کے بعد ہر نفس مجبور ہوگا کہ جو کچھ اس نے دنیا میں کیا ہے اس کے اخلاقی نتائج سے دوچار ہو۔

اصل اصلہ حقیقت یہ بات کہ ایک یوم جزا آنے والا ہے، قرآن میں جس اہتمام سے بیان ہوئی ہے، اس کو دیکھ کر عام ذہن تو یوں محسوس کرتا ہے کہ یہ بھی ایمان باللہ کی طرح اپنی ایک مستقل اصل اور حیثیت رکھتی ہے۔ بلکہ فی الواقعہ یہ ایمان باللہ کی ایک فرع ہے، یا یوں کہیے کہ اس کا ایک قریب ترین مقتضا ہے۔ اس لیے کہ

ایمان باللہ کے معنی ہیں ذات خداوندی اور صفات باری تعالیٰ کا ٹھیک ٹھیک تصور اور اذعان۔ ان صفات میں جو صفتیں نمایاں ترین ہیں اور جن کے جلوے ہر سمت پھیلے نظر آتے ہیں، ان میں عدل، حکمت، رحمت اور حاکمیت کی صفات بھی ہیں۔ یہ چاروں صفات چاہتی ہیں، اور اپنا پہلا مطالبہ ہی یہی پیش کرتی ہیں کہ ایک نہ ایک دن جزا و سزا کی میزان آویزاں کی جائے۔ ورنہ یہ صفات، ناقص، اور کمال سے عاری قرار پاتی ہیں، اور ناقص اور کمال سے عاری صفات ذات الٰہی سے اس وقت تک منسوب نہیں کی جاسکتیں جب تک کہ خالق کو مخلوقات کی صف میں نہ لا کھڑا کیا جائے۔

آیئے دیکھیں کہ یہ صفتیں ایک یوم جزا کے آنے کو کیوں کر مستلزم، اور اس کی متقاضی ہیں۔ ویسے تو یہ ایک مستقل بحث ہے جو غور و فکر کی ایک طولانی تفصیل چاہتی ہے، لیکن اس تفصیل کا یہ موقع نہیں اس لیے یہاں صرف چند سرسری اشارات پر ہی اکتفا کیا جائے گا۔

عدل کے معنی ہیں کانٹے کی تول حق رسانی، یعنی جو شخص جس حق اور جس انجام کا مستحق ہو وہ ٹھیک ٹھیک اس کے سامنے رکھ دیا جائے۔ پس اگر اللہ تعالیٰ عادل ہے تو اس کا مجرد عادل ہونا ہی تقاضا کرتا ہے کہ ہر شخص کو اس کے اعمال کا ٹھیک ٹھیک بدلہ ملے۔ اس نے جو اخلاقی حدود مقرر کیے ہیں ان کی پابندی کرنے والے کو اپنی خوشنودیوں اور نعمتوں سے شاد کام کرے، اور جس نے ان حدود کا پاس نہ کیا ہو

اس کو قرار واقعی سزا دے۔ عدل و انصاف کا یہ وہ بنیادی اصول ہے جس سے آج تک اختلاف ممکن نہیں ہو سکا ہے۔ دنیا میں کسی نے بھی دوست اور دشمن، فرمانبردار اور نافرمان، اطاعت کیش اور باغی، دونوں کو ایک برتاؤ کا اہل نہیں سمجھا ہے، تو یہ گمان کیسے کیا جا سکتا ہے کہ وہ ذات، جو سراپا عدل و انصاف ہے، وہ اپنے تابعداروں اور باغیوں میں تمیز نہ کرے گی! چنانچہ اس نے خود ان لوگوں سے جو اپنی بدکرداریوں اور نافرمانیوں میں ڈوبے ہوئے تھے اور اپنے اعمال بد کے انجام سے بے فکر تھے، حیرت کے انداز میں، اور زجر و ملامت کرتے ہوئے پوچھا اور بارہا پوچھا، کہ نادانو! جب یہ ایک حقیقت ہے کہ اندھا آنکھوں والے کے، تاریکی روشنی کے، سایہ دھوپ کے اور مردہ زندہ کے برابر نہیں ہو سکتا، (وَمَا يَسْتَوِي الْأَعْمَىٰ وَالْبَصِيرُ وَلَا الظُّلُمَاتُ وَلَا النُّورُ وَلَا الظِّلُّ وَلَا الْحَرُورُ وَمَا يَسْتَوِي الْأَحْيَاءُ وَلَا الْأَمْوَاتُ) اور یقیناً تم اس حقیقت سے انکار نہیں کر سکتے، تو پھر تمہارے دماغ میں، بقائمیٔ ہوش و حواس، اتنی بڑی غیر معقول بات کیونکر سما جاتی ہے کہ ہم مسلم اور مجرم دونوں کو ایک سطح پر رکھیں گے؟ (أَفَنَجْعَلُ الْمُسْلِمِينَ كَالْمُجْرِمِينَ مَا لَكُمْ كَيْفَ تَحْكُمُونَ؟)

غرض نیکوکاروں کو اچھا اور بدکاروں کو برا بدلہ ملنا، اور ان کے اعمال کے عین مطابق ملنا عدل خداوندی کا سب سے پہلا اور لازمی تقاضا ہے۔ مگر اس دنیا میں عملاً ہو کیا رہا ہے؟ کیا ایسا نہیں کہ یہاں کی خوش حالیاں، یہاں کی زینتیں،

یہاں کی نعمتیں، یہاں کی سربلندیاں بالعموم ان کو نہیں ملتیں جو اہل حق ہیں، بلکہ الٹی ان کے حصہ میں آتی ہیں جو حق کے دشمن اور احکام الٰہی کی دھجیاں اڑانے والے ہیں؟ اسی طرح کیا وہ، جو ان احکام کی پیروی کرتے ہیں، ان کے گردوپیش بدحالیاں، گمنامیاں، مظلومیتیں نہیں چھائی رہتی ہیں؟ کیا یہاں ایسا نہیں ہوتا کہ بدی، ظلم، کجروی اور بے ایمانی کی راہ دولت وعزت کے عشرت کدوں میں لے جاتی ہے اور نیک روی، حسن خلق، حق شناسی اور خدا پرستی کا راستہ ان خارزاروں میں پہنچا دیا کرتا ہے جہاں مصیبتوں کے کانٹے انسان کے جسم و روح کو چھلنی بنا دیتے ہیں؟ ظاہر ہے کہ یہاں یہی سب کچھ ہو رہا ہے اور ہماری آنکھیں نت اسی حقیقت کا مشاہدہ کرتی رہتی ہیں، تو اگر کوئی دوسرا عالم نہ برپا ہو، اور کوئی ایسا دن نہ آئے جس میں اس صورت حال کو پلٹ دیا جائے، اور ہر شخص کا حساب اس کے اعمال کے صحیح استحقاق کے مطابق چکا دیا جائے تو خدا کا وہ عدل کہاں رہا جو اس کی بدیہی صفات کمال میں سے ہے! اس لیے اگر خدا عادل ہے تو ایک یوم الحساب کا آنا اس کے عدل کا ویسا ہی لازمہ ہے جیسا کہ عدل اس کی خدائی کا۔

اب صفت حکمت کو لیجئے۔ حکیم کہتے ہی اس کو ہیں جس کا کوئی فعل حکمت اور مقصدیت سے خالی نہ ہو۔ جو جتنا بڑا حکیم ہوگا، اس کے افعال اتنے ہی زیادہ بامقصد اور پُراز حکمت ہوں گے۔ یہ ایک عام مسلمہ ہے، اور علم و منطق کے ابتدائی بدیہیات میں سے ہے۔ اس بدیہی حقیقت کی روشنی میں اس حکیم و دانائے مطلق

کے افعال و شئون پر نگاہ ڈالیے جو سراپا دانش اور منبع حکمت ہے۔ یہ کارگاہِ عالم، جو آپ کی نگاہوں کے سامنے - - - - - - - اور آپ کی حدود نظر میں ہے، اسی حکیم کے کارناموں کا ایک باب ہے۔ اس پر غور کیجئے اور دیکھیے کہ یہ عظیم الشان کائنات، جس کے تمام اجزا منظم طور پر سعی و حرکت میں لگے ہوئے ہیں، جس کے مختلف حصوں اور متضاد عناصر میں کامل توافق اور ہم آہنگی نظر آرہی ہے، جس کا ایک ایک واقعہ علّت و معلول کے ناقابل شکست شیرازہ میں بندھا ہوا ہے، کیا یہ کائنات اپنی تخلیق کے پیچھے کوئی غایت نہیں رکھتی؟ جس کائنات کا ہر جزو اپنی جگہ نہایت کھلے ہوئے مقاصد کا حامل ہے، کیا وہ بحیثیت مجموعی اپنا کوئی مقصد نہیں رکھتی؟ یعنی کل کا ہر جزو تو بجائے خود با مقصد ہو، مگر کل بے مقصد ہو! عقل سلیم اُسے کیسے مان سکتی ہے؟ اور پھر یہ انسان جس کو عقل و فکر کی بے نظیر صلاحیتیں اور سعی و عمل کی غیر معمولی قابلیتیں دے کر بھیجا گیا ہے، کیا اس کی آفرینش مقصدیت سے تہی دامن ہو سکتی ہے؟ جس انسان کی چاکری میں زمین کے ذروں سے لے کر آسمان کے آفتاب و ماہتاب تک لگے ہوئے ہوں، وہ خود کسی غایت و مقصد کی غلامی سے آزاد ہے؟ خالق کائنات کو حکیم ماننے والا اس سوال کا جواب اثبات میں کیسے دے سکتا ہے۔ اس کی بصیرت کی نگاہیں تو جب بھی ان حقایق پر پڑیں گی معاً اس کا دل بے اختیار پکار اُٹھے گا کہ رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هٰذَا بَاطِلًا سُبْحَانَكَ فَقِنَا عَذَابَ النَّارِ۔ [خدایا! تو نے یہ کارخانہ عبث نہیں بنایا ہے، تو اس سے

برتر ہے کہ کوئی کارِ عبث کرے پس یقیناً ہمارا وجود ایک بامقصد اور ذمہ دار وجود ہے، لہٰذا مقصد فراموشی اور غیر ذمہ داری کے وبال یعنی، عذاب جہنّم سے ہمیں بچانا ہے اور وہ جب بھی خدا کی صفتِ حکمت کا تصوّر کرے گا تو اس کی زبان زبانِ الٰہی سے ہم نوا ہو کر باندازِ استعجاب دنیا سے سوال کرے گی کہ :-

اَیَحْسَبُ الْاِنْسَانُ اَنْ يُّتْرَكَ سُدًى (قیامہ)	کیا انسان یہ گمان کرتا ہے کہ اسے یوں ہی چھوڑ دیا جائے گا؟
اَفَحَسِبْتُمْ اَنَّمَا خَلَقْنٰكُمْ عَبَثًا وَّاَنَّكُمْ اِلَيْنَا لَا تُرْجَعُوْنَ (مومنون)	کیا تم لوگوں نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ تم بلا کسی مقصد کے پیدا کیے گئے ہو اور تمہیں ہمارے یہ پلٹ کر آنا نہیں ہے؟

اس کے بعد صفت رحمت پر غور کیجئے۔ اس صفت کے واضح تقاضوں میں سے ایک تقاضا یہ بھی ہے کہ ایک یوم مکافات برپا ہو، تاکہ ان بندگانِ حق کی سعی و جہد کا، جنھوں نے اپنی خواہشوں پر محض رضائے الٰہی کے لیے بہت سی پابندیاں برداشت کیں اور جو دنیا میں محض خدا کی خاطر مصائب و آلام کا شکار ہوئے، خالق کی طرف سے اعتراف کیا جائے اور انہیں اللہ تعالےٰ کی رحمانیت اپنی آغوشِ شفقت میں لے کر اس طرح ان پر سے دنیوی رنج و غم کے غبار کو جھاڑ دے جس طرح ایک شفیق ماں اپنے فرماں بردار لاڈلے بچے کی بلائیں لے کر اس کو دل شاد کرتی ہے جب کہ وہ اس کے حکم کے بموجب کسی کٹھن مہم میں اپنے پسینے بہا کر واپس

آیا ہو، ورنہ خدا کا رحیم ہونا تو درکنار اس کو ناقدر دانی سے بے مروتی اور سنگ دلی سے بری ثابت کرنا بھی ممکن نہ رہے گا۔ تعالی اللہ عنہ۔ پس اس کی رحمت گواہ ہے اس بات پر کہ ایک یوم جزا آکر رہے گا۔ اس گواہی کے تذکرے خود قرآن کے اندر موجود ہیں۔ اس کے ان الفاظ پر غور کیجیے:۔

كَتَبَ عَلٰى نَفْسِهِ الرَّحْمَةَ	اس نے اپنے اوپر رحمت لازم کر لی ہے
لَيَجْمَعَنَّكُمْ اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ	(اس لیے) وہ قیامت کے دن تم سب
لَا رَيْبَ فِيْهِ	کو ضرور جمع کرے گا، جس کے آنے میں کوئی
(انعام)	شک نہیں۔

مزید استشہاد کے طور پر اگر آپ چاہیں تو سورۂ فاتحہ کے ابتدائی الفاظ بھی پڑھ لیں، جن میں اللہ تعالیٰ کی رحمانیت اور رحیمیت کے ذکر کے بعد ہی مالِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ فرمایا گیا ہے جو دراصل اسی حقیقت کا اظہار ہے کہ اللہ تعالیٰ اس وقت تک کامل رحمان و رحیم ہو نہیں سکتا جب تک کہ وہ ایک یوم الدین (بدلے کا دن) نہ لائے۔

رہی اللہ تعالیٰ کی صفت حاکمیت تو جزا و سزا کے بغیر اس کا وجود ہی خطرے میں پڑ جاتا ہے، بلکہ ایک مذاق بن کر رہ جاتا ہے۔ ذرا تصور کیجیے اس حاکمیت مطلقہ کی شان کا جس کا حال یہ ہو کہ اس کی مسلسل نافرمانیاں کرنے والے بلکہ اس کے مقابلہ میں خود اپنی حاکمیت کا علم بغاوت بلند کرنے والے اس کے سامنے حاضر

تک نہ ہوں، اور ان سے کسی بھی جرم کی نہ باز پرس ہو نہ کوئی سزا نہیں بھگتنی پڑے، اللہ تعالیٰ کی صفت عزت کا جس کی صفت حاکمیت ایک شاخ ہے، قرآن میں جو بار بار اعادہ کیا گیا ہے اس کا ایک اہم تر مقصد یہ بھی ہے کہ وہ جزا و سزا پر دلیل و برہان کا کام دے۔

بنیادی اہمیت

اس میں شبہ نہیں کہ جہاں تک ایمان بالآخرت کی اصل اور حقیقت کا تعلق ہے وہ فی الواقع ایمان باللہ ہی کی فرع ہے، اور اس لیے اس کے مقابلہ میں اس کی حیثیت ثانوی ہے، جیسا کہ اوپر کی تفصیل سے آشکارا ہو چکا، مگر دین حق کی اطاعت و اقامت کے زاویہ نظر سے، اور انسانی زندگی پر اپنے اثرات کے لحاظ سے یہ اس کے مقابلہ میں کسی طرح بھی کم اہمیت کا مالک نہیں، بلکہ بعض اعتبارات سے تو اس سے بھی بڑھ کر محسوس ہوتا ہے۔ انسان کی جبلت میں جو عجلت پسندی، حاضر طلبی اور عاجلہ پرستی رکھی گئی ہے اس کو دیکھتے ہوئے کسی طرح بھی باور نہیں کیا جا سکتا کہ محاسبہ اعمال کا اندیشہ نہ ہونے کے باوجود وہ نیکی اور حق پرستی کی سنگلاخ وادی قطع کرنے پر تیار ہوگا[1]۔ اس کو خدا کی ذات اور

---

[1] بعض صوفیا کا یہ کہنا کہ جس نے قیامت کے اندیشے اور عذاب دوزخ کے خوف اور جنت کے لالچ سے اطاعت و بندگی کی راہ اختیار کی، اس نے فی الحقیقت شرک کیا، مومن کی شان یہ ہے کہ جنت اور دوزخ سے بے نیاز ہو کر خدا کی والہانہ بندگی محض اس بنا پر کرے
(باقی برصفحہ)

اس کی یکتائی کا لاکھ یقین سہی مگر جب اسے یہ معلوم ہو کہ میرے ہر عمل کا آخری انجام وہی ہے جو اس دنیا میں ظاہر ہوتا ہے اور موت کا پردہ گرتے ہی زندگی اور

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۶۵) کہ وہی تمام صفات و کمال کا جامع اور وہی حسن مجسم ہے، نہ کہ کسی خوف و لالچ کی بنا پر" یہ وہ اصل عالم جذب اور جوش محبت میں نکلے ہوئے الفاظ ہیں جن میں حقیقت سے زیادہ شاعرانہ غلو کارفرما ہے۔ یہ تو عین ممکن ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف توجہ اور انابت کی کثرت کسی خاص مقام پر پہنچ کر روح انسانی میں ایسی وارفتگی اور انجذابی کیفیت پیدا کر دے کہ اس کے احساسات پر سے اندیشہ جزا و سزا کے نقوش اکثر اوقات میں قریباً ناپید ہو جایا کریں اور صرف محبت ہی کے جذبات چھائے ہوئے رہ جائیں، مگر یہ امکان کبھی بھی تسلیم نہیں کیا جا سکتا کہ اول روز ہی سے یہ کیفیت حاصل ہو سکتی ہے یا ہر آن قائم رہ سکتی ہے اور انسان آخرت کے کھٹکے کو اپنے دل میں جگہ دیئے بغیر ہی اس راہ دشوار پر قدم رکھ سکتا اور مسلسل آگے بڑھ سکتا ہے۔ اس کے بخلاف جہاں تک آغاز کار کا تعلق ہے اس میں تو خوف آخرت ایک اہم عنصر، بلکہ شاید اصل محرک کی حیثیت رکھتا ہے اور اس محرک کے بغیر نفس انسانی بندگی کی قیود برداشت کرنے پر آمادہ ہی نہیں ہو سکتا۔ ہاں آگے چل کر جب محبت کے جذبات تیز تر ہو جائیں، بہت ممکن ہے کہ اس سے بے نیازی برت لی جائے، مگر یہ یاد رہے کہ یہ بے نیازی کسی حال میں بھی خطرات سے خالی نہیں، اور واقعات بتاتے ہیں کہ کتنے ہی ارباب سلوک اسی ترنگ میں اپنے آپ کو تباہ کر بیٹھے۔ اسی لیے مومن کی صفت شریعت کے مزاج شناسوں

(باقی برصفحہ ۶۷)

اس کی تمام حرکات کا تماشہ ہمیشہ کے لیے ختم ہو جانے والا ہے، تو نرا نادان ہی ہو گا اگر اس نے "تعیش کوش" کے فتوے پر عمل نہ کیا، اور دنیا اس کی بدقسمتی کا ماتم ہی

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۶۶) نے یہ بیان کی ہے کہ مومن وہ ہے جو خدا کی بندگی بیک وقت خوف اور رجا (محبت) دونوں کے ملے جلے جذبات کے ساتھ کرے، اسی نقطہ سے آغاز بھی کرے اور اسی پر اس کا انجام بھی ہو، چنانچہ قرآن مجید نے جہاں سچے مومنوں اور رحمت الٰہی کے اہل ترین بندوں کی یہ خصوصیت بتائی ہے کہ ان کی محبت کا اصل مرکز ذاتِ الٰہی ہے (وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا اَشَدُّ حُبًّا لِلّٰہِ) وہاں ان کے متعلق یہ بھی کہا ہے۔ پورے مدح سرایانہ انداز میں کہا ہے، اور ان کے کمال بندگی پر اپنی مہر رضا ثبت کرتے ہوئے کہا ہے کہ:

وَالَّذِیْنَ یُؤْتُوْنَ مَآ اٰتَوْا	اور وہ لوگ جو راہ خدا میں جو کچھ دیتے ہیں اس
قُلُوْبُهُمْ وَجِلَةٌ اَنَّهُمْ اِلٰى	خوف سے بھرے ہوئے دلوں کے ساتھ دیتے ہیں
رَبِّهِمْ رٰجِعُوْنَ (المومن ۴)	کہ انہیں اپنے رب کے پاس لوٹ کر جانا ہے۔
یُوْفُوْنَ بِالنَّذْرِ وَیَخَافُوْنَ	(یہ "ابرار" اور "عباد اللہ" وہ ہیں جو اپنی نذروں
یَوْمًا كَانَ شَرُّهٗ مُسْتَطِیْرًا....	کو پورا کرتے ہیں اور اس بڑے دن سے ڈرتے
.....اِنَّا نَخَافُ مِنْ رَّبِّنَا یَوْمًا	ہیں جس کی ہولناکی عام اور ہمہ گیر ہوگی.....
عَبُوْسًا قَمْطَرِیْرًا (الدھر)	... وہ کہتے ہیں کہ ہم اپنے رب کی طرف سے

ایک سخت اور تلخ دن کا خوف رکھتے ہیں (اور اسی لیے یہ اعمال صالحہ کرتے ہیں)

کرے گی، اگر اس نے جی کھول کر داد نفسانیت نہ دی۔ بخلاف اس کے اگر اس کو قیامت کے آنے اور اعمال کا حساب کتاب لیے جانے کا پورا یقین ہو تو بہر حال اس سے یہ توقع کی جاسکتی ہے کہ وہ اپنے نفس کو کسی نہ کسی اخلاقی ضابطہ کا پابند رکھے گا، نہ صرف وحدانیت کا قائل ہونے ہی کی صورت میں بلکہ بہت ممکن ہے کہ کسی حد میں مشرک ہوتے ہوئے بھی۔ یہ دوسری بات ہے کہ مشرکانہ عقائد خدا کے

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۶۷) اس قسم کی آیات قرآن میں ایک دو نہیں، بے شمار ملیں گی۔ ان آیات میں معمولی اہل ایمان کی صفات نہیں بیان کی گئی ہیں بلکہ ان میں ان ارباب ایمان کے ایمان کا نقشہ کھینچا گیا ہے جو صحیح مومن ہیں جن کو "اُلٰٓئِکَ ھُمُ الْمُؤْمِنُوْنَ حَقًّا" کہا گیا ہے، جن کو "اَلْاَبْرَار" کے خطاب سے نوازا گیا ہے، جن کو "عباداللہ" اور "عباد الرحمٰن" کی سند محبوبیت مرحمت فرمائی گئی ہے۔ ان آیات کے آئینے میں کامل المعیار ایمان کا نقشہ دیکھیے اور اندازہ کیجئے کہ تصور قیامت اور خوف آخرت کا نشان اس نقشہ میں کس قدر ابھرا ہوا ہے۔ اس کو دیکھ کر کون یہ کہنے کی جرأت کرسکتا ہے کہ نیکی و تقویٰ اور سچی بندگی کا حق ادا کرنے میں قیامت کا یقین ایک مرکزی حیثیت اور ضروری شرط کا درجہ نہیں رکھتا ہے؟ حد یہ ہے کہ اس مقرب ترین بندے کی زبان سے بھی جس کا تقرب ناقابل تصور اور جس کی محبت اور محبوبیت ماورائے تمنا ہے، اطاعت حق پر جمے رہنے اور نافرمانی رب سے مجتنب رہنے کی وجہ یہ ظاہر کرائی گئی ہے کہ "مجھے ایک یوم عظیم کی سزا کا خوف ہے" قُلْ اِنِّیْٓ اَخَافُ اِنْ عَصَیْتُ رَبِّیْ عَذَابَ یَوْمٍ عَظِیْمٍ "پھر تا بدیگراں چہ رسد (ص)

ہاں اس کے اعمال کو میزانِ محاسبہ میں بے وزن بنا دیں، لیکن جہاں تک اس دنیا کا تعلق ہے ایک مشرک کا ایک منکرِ قیامت کے مقابلہ میں کسی ضابطہ اخلاق کا پابند ہونا زیادہ قرینِ قیاس ہے، اور اس سے نسبتاً اس بات کی زیادہ توقع قائم کی جا سکتی ہے کہ وہ ہوائے نفس کے ہاتھوں میں بالکلیہ اپنی زمامِ کار سونپ دینے سے مجتنب رہے گا۔ اس لیے انسانی اخلاق و کردار پر اپنی تاثیر کے لحاظ سے ایمان بالآخرۃ کو ایمان باللہ کے برابر، بلکہ بعض اعتبارات سے اس سے بڑھ کر اہمیت دینا خلافِ واقعہ نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن نے جس شد و مد اور جس تفصیل و تصریف کے ساتھ توحید پر دلائل دیے ہیں قیامت کے وقوع پر آفاق و انفس کی محکم اور دل نشین شہادتیں بہم پہنچانے میں اس سے کچھ کم زور نہیں صرف کیا ہے۔ قرآن پر نگاہ ڈالیے تو صفحے کے صفحے، اور مکی سورتوں میں تو قریب قریب پوری کی پوری سورتیں جزائے عمل کے دلائل اور اس کی ضرورت، قیامت کے کوائف اور دوزخ کی پر ہول سزا کے ذکر سے اور پھر ساتھ ہی جنت کی ابدی نعمتوں کے تذکرے سے لبریز نظر آئیں گی، جو شہادت ہے اس امر کی کہ قرآن کے نزدیک عقیدۂ آخرت کا دلوں میں اذعان پیدا کرنا توحید کے بعد، تمام حقائقِ دینی سے اہم تر اور مطلوب تر ہے۔ جس قرآن کے اعجاز و بلاغت کی قسمیں کھائی جاتی ہیں اس کا کسی امر کے ساتھ یہ غیر معمولی اعتنا اس بات کا ایک ناقابلِ تردید ثبوت ہے کہ اس کی نگاہ میں اس ایک امر کی دوسرے حقائقِ دینی پر وہی فوقیت ہے جو فوقیت آفتاب کو اپنے گرد گھومنے والے

کروں پر حاصل ہے۔ جس طرح آفتاب کا مرکز کشش ان تمام اجرام فلکی کے قیام و بقاء کا، اور اس کا سرچشمۂ نور ان سب کی تابناکیوں کا ضامن ہے اسی طرح یہ عقیدۂ آخرت (عقیدہ توحید سے ہم دست ہو کر) ساری نیکوکاریوں کا کفیل ہے۔ اگر اس عقیدہ کو یہ اہمیت حاصل نہ ہوتی تو وہ قرآن جس نے نماز جیسی عبادت کا صرف حکم دینے پر اکتفا کر لیا اور اس کے احکام، اس کے طریق ادا اور اس کی رکعات اور ارکان وغیرہ کی تفصیلات بیان کرنے پر چند کلمات کہنا اور چند لمحے دینا بھی غیر ضروری سمجھا، وہ اس کے بیان کے سلسلے میں الفاظ اور اوقات کے اس بے دریغ خرچ سے ہرگز کام نہ لیتا جس کا مشاہدہ قرآن کے صفحات میں ہم کر رہے ہیں

ایمان بالآخرت کی اہمیت کا اندازہ ایک اور پہلو سے لگائیے۔ یہ ایک مسلّم حقیقت ہے کہ قرآن کی دعوت عقیدہ توحید پر قائم ہے، اس لیے جس قدر زور اثباتِ توحید پر اس نے دیا ہے، حق یہ ہے کہ اسے دینا ہی چاہیے تھا۔ مگر اس زور اور اہتمام کے باوجود جب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ کٹر منکرین اسلام نے اپنی جگہ سے جنبش نہ کھائی تو ایک حیرت سی ہوتی ہے، کیونکہ قرآن نے عام طور سے استدلال کا جو طریقہ اختیار فرمایا ہے وہ شک اور تردد کی ایک ایک گرہ کھول کر رکھ دینے والا ہے، جس کے بعد انکار توحید کے لیے ضد اور ہٹ دھرمی کے سوا اور کوئی بنیاد باقی نہیں رہ سکتی۔ مگر بایں ہمہ ہم دیکھتے ہیں کہ اختلاف کا زور اور انکار و تکذیب کا طوفان جوں کا توں برابر قائم رہا، نہ صرف قائم رہا بلکہ اس میں مزید شدت

پیدا ہوتی رہی۔ اس عجیب و غریب صورت حال کی توجیہہ سے عقل و منطق تو درماندہ رہ جاتی ہیں مگر اسرار غیب کا جاننے والا اور نفسیات انسانی کا خالق یہ کہہ کر اس راز سے پردہ اٹھاتا ہے کہ:۔

وَاِذَا قَرَأْتَ الْقُرْاٰنَ جَعَلْنَا بَيْنَكَ وَبَيْنَ الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ حِجَابًا مَّسْتُوْرًا وَّ جَعَلْنَا عَلٰى قُلُوْبِهِمْ اَكِنَّةً اَنْ يَّفْقَهُوْهُ وَفِيْٓ اٰذَانِهِمْ وَقْرًا وَاِذَا ذَكَرْتَ رَبَّكَ فِي الْقُرْاٰنِ وَحْدَهٗ وَلَّوْا عَلٰٓى اَدْبَارِهِمْ نُفُوْرًا۔

(بنی اسرائیل ۴۵ تا ۴۶)

اے پیغمبر! جب تم قرآن پڑھتے ہو (اور ان کو سناتے ہو) تو ہم تمہارے اور ان منکرین آخرت کے درمیان بڑی سخت روک حائل کر دیتے ہیں، اور ان کے دلوں پر پردے ڈال دیتے ہیں تاکہ وہ اس (قرآن) کو سمجھ نہ پائیں۔ نیز ان کے کانوں کو بہرا کر دیتے ہیں۔ اور جب تم قرآن کے اندر صرف اکیلے اپنے رب ہی کا ذکر کرتے ہو تو وہ بدک کر منہ موڑے بھاگ کھڑے ہوتے ہیں۔

یہ الفاظ قرآنی کسی شرح اور تفصیل کے محتاج نہیں۔ یاد رہے کہ ان سے پہلے توحید ہی کا بیان ہو رہا تھا اور اللہ تعالیٰ کے لاشریک ہونے پر دلائل دیے جا رہے تھے، اس کے بعد ہی ان الفاظ کا آنا معنی یہ رکھتا ہے کہ یہاں کافروں کے قرآن سے بے بہرہ رہنے کا مطلب اس کی دعوت توحید سے بے بہرہ رہنا ہے چنانچہ خود ان ہی آیات کے آخری الفاظ میں بھی اسی توحید ہی کا، اور اس سے

ان کی شدتِ نفرت کا ذکر ہے۔ یوں یہ الفاظ اس امر کی بیّن شہادت بہم پہنچا رہے ہیں کہ قرآنی دلائل توحید اگر ان کفار پہ اثر انداز نہیں ہوتے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ دل اندیشۂ فردا سے ناآشنا ہیں۔ یہ ناآشنائی طلب ہدایت سے بے اعتنائی کی شکل میں ظہور کرتی ہے، اور طلبِ ہدایت سے بے اعتنائی اللہ کے قانون ہدایت و ضلالت کے مطابق ہدایت سے محرومی کا سبب بن جاتی ہے، جس کا اظہار اللہ، مسبب الاسباب، اپنے شاہانہ انداز کلام میں یوں فرماتا ہے کہ "ہم تعلیمات قرآن کے اور منکرین قیامت کے مابین بڑی سخت روک حائل کر دیتے ہیں"۔

دوسرے مقامات پر اس سے بھی زیادہ صراحت موجود ہے۔ سورہ نحل میں ہے:۔

اِلٰهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ فَالَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ قُلُوْبُهُمْ مُّنْكِرَةٌ وَّهُمْ مُّسْتَكْبِرُوْنَ۔	تمہارا معبود ایک ہی ہے لیکن جو لوگ آخرت پر ایمان نہیں رکھتے ان کے دل اس کے ماننے سے انکاری ہیں اور وہ کبر کے نشہ میں ہیں۔

اسی طرح سورہ المومنون میں فرمایا گیا:۔

وَاِنَّكَ لَتَدْعُوْهُمْ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ وَاِنَّ الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ عَنِ الصِّرَاطِ لَنٰكِبُوْنَ	بالیقین تم انہیں توحید کی سیدھی راہ کی طرف بلاتے ہو، پر جنہیں آخرت کا یقین نہیں وہ اس راہ سے کترائے جاتے ہیں۔

توحید ہی کا سا رسالت کا بھی حال ہے، جو قرآن کے بنیادی اصول و عقائد میں سے ایک ہے۔ اس پر قرآن نے جو مسکت اور طمانیت بخش دلائل دیے وہ بھی ان ائمہ کفر کے دلوں میں نہ اُتر سکے۔ کیوں؟ اس کی وجہ آپ کو سورہ فرقان کے اندر بالکل بے حجاب ملے گی جس میں نبوت محمدیؐ پر سارے اعتراضات اور شکوک کا ازالہ فرمانے کے بعد آخر میں کہا گیا ہے کہ:۔

بَلْ كَذَّبُوا بِالسَّاعَةِ (در اصل اس انکار مسلسل کی وجہ یہ ہے)
کہ انہوں نے قیامت کو جھٹلا رکھا ہے۔ (الفرقان-۱۱)

گویا توحید ہو یا رسالت، یا قرآن، یا کوئی اور حقیقتِ دین، اس پر چاہے آپ دلائل و براہین کے کتنے ہی انبار کیوں نہ لگا دیں، رائی کے برابر بھی ان کا اثر نہیں ہو سکتا اگر مخاطب کا دل و دماغ اندیشہ آخرت سے خالی ہو۔ عقل بھی کہتی ہے کہ ایسا ہی ہونا چاہیے، اور تجربہ گواہ ہے کہ ایسا ہی ہوا کرتا ہے۔ اگر ایک انسان یہ نہ سمجھتا ہو کہ ایک دن مجھے اپنے اعمال کا حساب و کتاب دینا ہے، خواہ یہ سمجھنا ضعف عقل کی بنا پر ہو، یا غیر ذمہ دارانہ اور فاسقانہ طرز زندگی سے عشق رکھنے کی بنا پر، بہر حال کوئی وجہ بھی ہو، اس صورت میں آپ اس سے ہرگز یہ توقع نہیں کر سکتے کہ وہ توحید کے دلائل، اس کے حقایق اور اس کے مقتضیات سننے کے لیے اپنے کانوں کو آمادہ، اپنے ذہن کو مستعد اور اپنے قلب کو متوجہ پائے گا۔ اس کے اندر ایسی سنجیدگی پیدا ہونی محال ہے

وہ نہیں مانتا کہ برائیوں اور نفس پرستیوں کے نتائج برُے ہوں گے، مگر آپ ہیں کہ اس کے سامنے ایک مکمل ضابطہ اخلاق پیش کر رہے ہیں، نیکی اور تقویٰ کی تلقین کر رہے ہیں، توحید اور رسالت، دین اور شریعت، ایمان اور اطاعت کے اصول وحقائق بیان کر رہے ہیں، ایسے اصول وحقائق جو اس کے سامنے برائی اور بھلائی، غلط اور صحیح، حق اور باطل کی تفریق کرنے والے ہیں، اس کی خواہشوں پر پابندیاں لگانے والے ہیں، اس کے عیش زندگی کو مکدر کرنے والے ہیں۔ ایسی صورت میں آپ اپنی باتوں کے جواب میں حقارت بھرے تبسم اور زہر بجھے طنز وتعریض کے سوا اس کی طرف سے اور کس سلوک کی توقع رکھ سکتے ہیں!

ایمان بالآخرت کی اس بنیادی اہمیت کی تصدیق ان بگڑی ہوئی قوموں کے حالات سے بھی ہوتی ہے جو اپنے دعوے کی رو سے توحی ورسالت کو تسلیم کرنے والی، توحید اور معاد کو ماننے والی، اللہ کی کتاب رکھنے والی اور دین و شریعت کی علم بردار ہوتی ہیں، مگر ایمان واسلام کے فخریہ دعاوی کے باوجود ان کے اعمال نامے خیر وفلاح کے نقوش سے قریب قریب خالی ہوتے ہیں۔ ایسی اقوام کی دین فراموشی دراصل ان کی آخرت فراموشی ہی کا نتیجہ ہوتی ہے۔ فکر آخرت سے ذہن غافل ہوا کہ شرائع سے اس کا رشتہ کٹنا شروع ہوا۔ نماز اتباع شرائع کی بنیاد اور سارے اعمال خیر کا سرچشمہ ہے (جیسا کہ آگے کی تفصیلات سے معلوم ہوگا) جو شخص اس سرچشمہ سے خدا پرستی کی توفیق نہیں حاصل کرتا وہ نیکی

سے اپنا رشتہ قائم نہیں رکھ سکتا، نہ وہ دین کے تقاضوں کو بھی پورا کر سکتا ہے، شریعت کی بندشیں اس کے نزدیک تارِ عنکبوت سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتیں، اخلاقی اقدار اس کی نگاہ میں ہرگز کسی اعتنا کے قابل نہیں ہوتیں مختصر یہ کہ ایسا انسان مرضیات الٰہی کے ذکر و فکر سے آزاد ہو کر نفس اور شہوات نفس کا پرستار بن کر رہ جاتا ہے، بنی اسرائیل کی پوری تاریخ غوایت، قرآن نے ان چار لفظوں میں سمیٹ کر بیان کی ہے :-

اَضَاعُوا الصَّلٰوۃَ وَاتَّبَعُوا الشَّهَوَاتِ (مریم) انہوں نے نماز ضائع کر دی تھی اور شہوات کے پیرو بن کر رہ گئے تھے۔

گویا شہوات کی پیروی براہ راست نتیجہ تھی نماز سے بے پروائی کا۔ اب آگے غور کرنے کی چیز یہ ہے کہ نماز جیسی قیمتی متاع، جس پر خدا پرستی اور اتباع دین کا سارا انحصار ہے، ضائع کیوں کر دی جاتی ہے؟ اس کا جواب قرآن یہ دیتا ہے کہ :-

اِنَّهَا لَكَبِيْرَةٌ اِلَّا عَلَى الْخٰشِعِيْنَ الَّذِيْنَ يَظُنُّوْنَ اَنَّهُمْ مُّلٰقُوْا رَبِّهِمْ (بقرہ) فی الواقع یہ (اقامت نماز) لوگوں پر بڑی شاق گذرتی ہے۔ سوائے ان لوگوں کے جو اپنے اندر خشوع رکھتے ہیں جنہیں اس بات کا خیال دامن گیر رہتا ہے کہ ہمیں اپنے رب کی جناب میں حاضر ہونا ہے۔

تو اب حقیقت یہ نکلی کہ دین کے عملی مرکزی ستون (نماز) کو قیام اور استحکام

بخشنے والی چیز صرف خوفِ آخرت ہے۔ آخرت فراموشی انسان کو نماز کا تارک اور ہوائے نفس کا غلام بنا دیتی ہے، ترکِ نماز اور اتباعِ شہوات پورا کاشانۂ دین مسمار کر کے رکھ دیتا ہے، اور انسان اسلام کو آباؤ اجداد کا ایک مقدس ورثہ سمجھ کر اسے زبانی خراجِ عقیدت پیش کرنا ہی اپنا کل فرض سمجھ لیتا ہے۔ اس طرح ایک کٹر منکرِ اسلام اور ایک دین فراموش مسلم، دونوں نفسیاتی طور سے ایک ہی جیسے مقام پر کھڑے نظر آتے ہیں۔ جس طرح توحید کے سارے دلائل اور دعوتِ قرآنی کے واضح براہین محض اس لیے منکرِ اسلام کے لیے ہوا کی ایک سنسناہٹ سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتے کہ اس کے اندر محاسبۂ اعمال کا اندیشہ موجود نہیں ہوتا، ٹھیک اسی طرح دین سے عملی رشتہ منقطع کر لینے والے نام نہاد مسلم پر اس وقت تک اتباعِ دین کا دروازہ بند ہی رہے گا جب تک کہ خوفِ جزا کی کلید اس کے ہاتھ نہیں آجاتی اس پہلو سے اگر دیکھا جائے تو ایمان بالآخرت کی اہمیت فزوں تر ہو جاتی ہے، اور چاہے نظری طور پر وہ ایمان باللہ کی ایک شاخ ہی کیوں نہ ہو، مگر حقیقت یہ ہے کہ عملاً اس سے بھی آگے دکھائی پڑتا ہے اور سارے خیر و صلاح کا مدار اصلی قرار پا جاتا ہے۔

ایمان بالآخرت کی عملاً یہی زبردست اہمیتیں ہیں جن کے باعث اس کو ایمان باللہ کا ایک جز اور فرع ہونے کے باوجود اساسِ دین کی تعمیر میں ایک مستقل

سنگ بنیاد کی حیثیت دی گئی ہے، جب کہ دوسرے تمام ایمانیات میں سے کسی کو اس مقام کا مستحق نہ سمجھا گیا۔ کیونکہ یہی دو ایمانیات ایسے ہیں جن کے صحیح تحقق پر انسانی زندگی کے سنورنے اور منشائے الٰہی کے مطابق بسر ہونے کا انحصار ہے۔ یہ اور صرف یہی، وہ دو پہیے ہیں جو اعمال انسانی کی گاڑی کو بندگی اور اطاعت حق کی شاہراہ پر چلاتے ہیں۔ اگر ان میں سے ایک پہیہ بھی غائب یا بیکار ہو جائے تو یہ گاڑی کبھی بھی اس راستہ پر نہیں چل سکتی۔ ایسی صورت میں یہ گاڑی شیطان کے ہاتھ میں پہنچ جاتی ہے جو اس کو اس شاہراہ حق سے ہٹا کر شر و طغیان کی سنگلاخ وادیوں میں گھسیٹتا پھرتا اور انجام کار ہلاکت کے گہرے کھڈ میں ڈال دیتا ہے۔ سچی ہدایت اور سچی اطاعت کے لیے ان دونوں عقائد کی یہی وہ غیر معمولی یکساں اہمیت ہے، اور نہ صرف اہمیت یکساں ہے بلکہ وہ خود اپنی عملی افادیت کے لیے ایک دوسرے کے سخت محتاج بھی ہیں، جس کے سبب قرآنِ حکیم نے دونوں کا ساتھ ساتھ ذکر کرنے کا اسلوبِ بیان عام طور سے اختیار کیا ہے اور جہاں کہیں بھی اس نے توحید کی تعلیم و ہدایت اور اس کے دلائل سے گفتگو کی ہے، وہاں بالعموم قیامت کے ذکر و اثبات سے ضرور تعرض کیا ہے۔ اور اسی طرح اس کے برعکس بھی اس اہتمام کی وجہ اس کے سوا اور کچھ نہیں ہے کہ انسان کو اس کی مرغوباتِ نفس سے روک کر اطاعت الٰہی اور نیکی و تقویٰ کی تلخ کامیوں پر آمادہ کرنا نہ تو تنہا عقیدہ توحید کے بس میں ہے اور نہ ہی

عقیدۂ آخرت کے امکان میں تنہا توحید اس سے مطالبہ کرے گی کہ خدا، حق پہچانو اور اخلاق و انصاف کا تقاضا ہے کہ اس کے احکام کی پابندی کرو، وہ جواب دے گا جب مجھے مرنے کے بعد نسیاً منسیا ہو جانا ہے اور خدا کے سامنے نہ حاضری دینی ہے اور نہ ہی اپنے اعمال کی جوابدہی کرنی ہے تو خواہ مخواہ اطاعت و بندگی کا یہ بارگراں اپنی گردن پر کیوں لادے پھروں؟ اسی طرح اگر قیام قیامت کا یقین اس سے کہیے کہ اللہ تعالیٰ کے فلاں فلاں حدود کی پابندی کرو، وہ فوراً جواب دے گا کہ نیچر نے مجھے پیدا کیا ہے، وہی مجھے فنا کرے گا، اور وہی اس پوری کائنات کو بھی ایک روز تباہ کر کے رکھ دے گا۔ یہ بیچ میں "اللہ تعالیٰ" کون سی چیز ہے، جس کے کچھ حدود بھی ہیں، جن کی مجھے پابندی کرنی ہے ؟ یا اگر وہ وجود الٰہی کو مانتا ہوگا، مگر ساتھ ہی توحید کا قائل نہ ہوگا تو یوں کہے گا کہ "خدا کا خالق کائنات ہونا برحق، اس کا رب اعلیٰ ہونا بھی بجا، اور قیامت کا آنا بھی یقینی، مگر یہ ارواح عظیمہ، یہ انبیاء، و ملائکہ، یہ اقطاب و بزرگان دین جن کی ہم نذریں چڑھاتے ہیں جن کے تھانوں اور مزاروں پر ہم سالانہ ماہانہ یا ہفتہ وار سجدے کر لیا کرتے ہیں، اور جن کو خوش رکھنے کے لیے ہم کوئی دقیقہ نہیں اٹھا رکھتے، یہ سب قیامت میں اعمال کی ترازو اٹھنے کب دیں گے اور ہمارے حساب کتاب کا دفتر کھلنے کیوں پائے گا۔ ان کی ایک سفارش ہماری بخشش کے لیے کافی ہوگی۔ اس لیے خدا کے احکام اور حدود کی بحث سے ہمیں کیا بحث!"

آخرت فراموشی کا سرچشمہ

جس ایمان بالآخرت کی یہ غیر معمولی حیثیت ہے کہ اس سے محرومی ہی دراصل ہر کفر اور ہر فسق کا منبع ہے، سوال یہ ہے کہ خود اس کا منبع کہاں ہے؟ دوسرے لفظوں میں جو آخرت فراموشی توحید و رسالت جیسے بنیادی حقائق سے اور نماز جیسے مرکزِ خیر و تقویٰ سے بے نیازی کا سرچشمہ ہے، اس کا اپنا سرچشمہ کہاں ہے؟ توحید اور دوسری صفاتِ الٰہی سے انسان اس لیے انکار کرتا ہے کہ اسے قیامت کا ڈر نہیں، اپنے خالق و مالک کے حقوق اس لیے نہیں ادا کرتا کہ اسے جزا و سزا کا اندیشہ نہیں، توحید کے دلائل اس پر اس لیے کوئی اثر نہیں کرتے کہ اسے اپنے رب کے حضور کھڑے ہونے کا کھٹکا نہیں، نبی کی نبوت وہ پوری بے نیازی سے اس لیے ٹھکرا دیتا ہے کہ اسے کسی باز پرس کا خوف نہیں، نماز چھوڑ کر پوری شریعت کو اک دفترِ بے معنی ٹھیرا لیتا ہے کیوں کہ فکرِ آخرت سے بے نیاز ہے، اور نفسانی خواہشوں کی جی کھول کر بندگی کرتا ہے کیونکہ غمِ فردا سے آزاد ہے —— مگر خود یہ غمِ فردا سے آزادی کہاں سے پیدا ہوتی ہے؟ سارے امراض کی جڑ جب یہی آخرت فراموشی ہے تو خود اس اُمّ الامراض کی جڑ کیا ہے؟ آخر قیامت اور آخرت پر بھی تو قرآن نے دلائل دیے ہیں، اُنہیں انسان کیوں ٹھکرا دیتا ہے اور بایں دانش و بینش فکرِ آخرت سے اتنا بے نیاز کیوں ہو رہتا ہے؟ کیوں ایسا ہوتا ہے کہ اسے آنے والے غیر معمولی حالات کے اندیشوں سے چونکایا جاتا ہے مگر

بات اس کے کان کے پردوں سے آگے نہیں بڑھتی؛ دلائل کی روشنی میں سے یوم حساب کا مشاہدہ کرایا جاتا ہے مگر اس کی آنکھیں کچھ دیکھنے سے انکار کر دیتی ہیں؛ اللہ کا ربانی کلام اور پیغمبر کی حکیمانہ دعوت اس کو مختلف طریقوں سے یہ امر واقعی ذہن نشین کرانا چاہتی ہے کہ تیری زندگی بے مقصد نہیں ہے بلکہ ایک بامقصد، ذمہ دار اور مسئول ہستی ہے اور تجھے اپنے اعمال کا حساب دینا ہے، مگر یہ سارے وعظ و پند بس ہوا میں بکھر کر اور فضا میں تحلیل ہو کر رہ جاتے ہیں اور وہ بدستور انکار کی مدہوشی میں مبتلا رہتا ہے؛ کیا اس کی وجہ یہ ہے کہ اس پر حقیقت واضح نہیں ہوتی اور دلائل اس کی آنکھیں نہیں کھول سکتے؛ نہیں کم از کم جہاں تک قرآن کے مخاطبین کا تعلق ہے، ایسا ہرگز نہیں ہے۔ قرآن اگر کلام ربانی ہے تو اس کے اس دعویٰ کے باوجود کہ وہ تِبْيَانًا لِّكُلِّ شَيْءٍ (ہر امر دینی کو روز روشن کی طرح عیاں کر دینے والا) ہے، یہ وہم کیسے کیا جا سکتا ہے؛ بالخصوص ایسی حالت میں جب کہ قرآنی شہادت کی رو سے وقوع قیامت کا معاملہ، ان محکم اور روشن دلیلوں کے بعد جو اس نے دی ہیں، اتنا ثابت شدہ اور یقینی معاملہ ہے کہ اس کے اندر شک کی کوئی گنجائش ہی نہیں:۔

إِنَّ السَّاعَةَ آتِيَةٌ لَّا رَيْبَ فِيهَا (کہف) — قیامت کی گھڑی یقیناً آنے والی ہے اس میں کوئی شک نہیں۔

اس کلام ربانی کے اندر تیقن کی جو شان ہے اس پر نظر ڈالیے، بس ایسا

محسوس ہوتا ہے کہ قرآن کے نزدیک گویا یہ ایک بدیہی مسئلہ ہے، اور ہر گونہ ناقابل انکار، مگر منکر ہے کہ اس کی زبان رو کے نہیں رکتی۔ پھر آخر اس انکار بے محابا کی وجہ کیا ہے؟ انکار جزا یا آخرت فراموشی کا وہ کون سا سرچشمہ ہے جو قرآن کی اس تبیین حقیقت کے باوجود خشک نہیں ہوتا اور اس کی جڑوں کو برابر سیراب کیے چلا جاتا ہے؟ قرآن کہتا ہے کہ اس سرچشمہ کا نام ہے دنیا پرستی اور حب عاجلہ:-

اِنَّ هٰٓؤُلَاۗءِ يُحِبُّوْنَ الْعَاجِلَةَ — حقیقت یہ ہے کہ یہ لوگ حاضر پر ریجھے ہوئے
وَيَذَرُوْنَ وَرَاۗءَهُمْ يَوْمًا — ہیں اور اس کے بالمقابل اس بھاری دن
ثَقِيْلًا (الدہر) — (قیامت) کو پس پشت ڈالے ہوئے ہیں۔

بَلْ تُؤْثِرُوْنَ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا (اعلیٰ) — بلکہ (اصل واقعہ یہ ہے) تم لوگ دنیوی
زُيِّنَ لِلَّذِيْنَ كَفَرُوا — زندگی کو (آخرت کے مقابلہ میں) ترجیح دیتے ہو
الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا (بقرہ) — دنیوی زندگی منکرین حق کی نگاہوں میں بچ بس گئی ہے

بَلْ تُحِبُّوْنَ الْعَاجِلَةَ وَ — بلکہ تم لوگ عاجلہ (دنیا) کو سینے سے
تَذَرُوْنَ الْاٰخِرَةَ (القیامہ) — لگائے اور آخرت کو چھوڑے بیٹھے ہو

بس یہ ہے ساری خرابیوں کی جڑ، یہ دنیا پرستی اور عاجلہ پسندی وہ بس کی گانٹھ ہے جو قلب انسانی کی رگوں میں فکر آخرت سے بے نیازی کا زہر پیوست کر دیتی ہے اور پھر اس کے فطری مزاج کو فاسد بنا ڈالتی ہے۔ جب تک اس زہر سے اس کا دل پاک نہیں ہوگا اس کے لیے خدا پرستی کی راہ اختیار کرنی محال

ہے۔ اگر وہ نام کا مسلم ہے تو پُر اثر سے پُر اثر مواعظ کی کوئی مقدار بھی اس کو حسن عمل پر آمادہ نہیں کر سکتی، خواہ وہ زبان سے آمنا وصدقنا کے نعرے کتنے ہی زور سے کیوں نہ لگاتا ہو۔ وہ اسلام کے صریح تقاضوں کو سُنے گا اور اس طرح اغماض کر جائے گا گویا وہ اس کا سرے سے مخاطب ہی نہیں ہے۔ اگر آپ زیادہ اصرار سے کام لیں گے تو وہ معذرتیں کرے گا، پھر تاویلوں کی نقاب مُنہ پر ڈال لے گا، اور بدرجہ آخر انتہائی جسارت کے ساتھ اسے اسلام کی صحیح تعبیر اور اس کا واقعی تقاضا ماننے ہی سے انکار کر دے گا۔

اسی طرح اگر وہ ایسا غیر مسلم ہے جو اپنے زبانی دعویٰ کے مطابق جزا سزا کا قائل ہے تو وہ قرآن کی دعوت پر ایمان لانے کی ہرگز توفیق نہ پائے گا اس لیے کہ اس کے اندر آخرت کی فکر اتنی مستحکم اور بیدار نہیں ہے جو اسے تحقیق حق پر سنجیدگی سے متوجہ ہونے کے لیے تیار کرے اور اپنے آبائی دین کے ساتھ جو تعصب رکھتا ہے اسے فلاح آخرت پر قربان کر دے۔

اور اگر وہ ایسا منکرِ اسلام ہے جو منکر قیامت بھی ہو، تو اس پر دلائل قطعیت ہرگز کارگر نہیں ہو سکتے۔ انسان کی فطرت یہ ہے کہ وہ جس چیز سے محبت کرتا ہے اس کی مخالف چیزوں کا نام سننا بھی پسند نہیں کرتا۔ اسے دنیا سے عشق ہے اور عشق دنیا کا حال یہ ہے کہ اس میں اور ایمان بالآخرت میں کھلا ہوا تضاد ہے ایک شے کا وجود دوسری کے وجود کا دشمن ہے۔ اس لیے جو قلب ہوائے نفس کا نشیمن

ہوگا، فکر آخرت کا طائر قدس اسے اپنا آشیانہ نہیں بنا سکتا۔

مصالحت کے فریب

لیکن یہ ایک ناقابل تردید حقیقت ہے کہ انکار و تکذیب کے اس سارے جوش و خروش کے باوجود، جو منکرین حق کی جانب سے داعیانِ حق کے جواب میں ظاہر کیا جاتا رہا ہے جزائے اعمال کا تصور کم از کم وہ اپنے لاشعور سے بالکل فنا نہ کر سکے تھے، اور رہ رہ کر یہ احساس ان کے دلوں میں کانٹے کی طرح کھٹک ہی جایا کرتا تھا کہ ایک باشعور، باعقل اور با اختیار مخلوق ہوتے ہوئے ہماری زندگی بے غایت اور غیر مسئول کیوں کر ہو سکتی ہے؟ نیز اس کائنات کے خالق اور پروردگار کی صفات عدل و حکمت سے جو چیز زیادہ مناسبت رکھتی ہے وہ ایک یوم حساب کا برپا کیا جانا ہی ہے، نہ کہ انسانی زندگی کا یوں ہی بلا حساب و کتاب اور بغیر اجر و سزا ختم ہو جانا چنانچہ مشرکین عرب کی یہی ذہنی کشمکش تھی جس کی کلام الٰہی نے ان لفظوں میں پردہ کشائی فرمائی ہے

عَمَّ يَتَسَاءَلُونَ عَنِ النَّبَإِ الْعَظِيمِ الَّذِي هُمْ فِيهِ مُخْتَلِفُونَ (سورہ نبا)

یہ لوگ کس شے کے بارے میں باہم پوچھ گچھ کرتے رہتے ہیں؟ اس بڑی خبر (یعنی قیامت) کے بارے میں، جس میں ان کی رائیں مختلف ہیں۔

دوسری جگہ صاف صاف یوں فرمایا کہ:

بَلِ ادَّارَكَ عِلْمُهُمْ فِي الْآخِرَةِ بَلْ هُمْ فِي شَكٍّ الخ (نحل ۶۶)

بلکہ حقیقت یہ ہے کہ آخرت کے بارے میں ان کا علم گڈمڈ ہے، بلکہ وہ شک میں پڑے ہیں۔

ایک طرف تو ان کے بارے میں قرآن کی یہ شہادت ہے کہ ان کا علم گنجلک ہے، وہ شک اور تردد میں مبتلا ہیں، وہ کوئی قطعی فیصلہ اس کے متعلق رکھتے ہی نہیں دوسری طرف قرآن ہی میں ان کے غوغائے انکار کا یہ عالم ہے کہ گویا ان کے نزدیک قیامت کا آنا اور حساب کتاب کا لیا جانا بداہتہً ناممکن ہے۔ بظاہر ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ان دونوں باتوں میں تضاد ہے۔ لیکن حقیقت میں کوئی تضاد نہیں، اور اگر کوئی تضاد ہے بھی تو چنداں قابلِ حیرت نہیں۔ غیر سنجیدہ، مفاد پرست، بے اصول اور محروم ہدایت دنیا میں اس سے بھی زیادہ عجیب و غریب تضاد واقعات کی صورت میں نمودار ہوئے ہیں اور ہوتے رہتے ہیں حقیقت یہ ہے کہ قیامت کے بارے میں ان کے ذہن کے اندر دو مختلف قسم کی نفسیات کشمکش کر رہی تھیں۔ ان کے احساسِ فطرت، اور ان کی خواہش میں ایک مسلسل جنگ برپا تھی۔ ایک طرف تو وہ انسان تھے اور سارے بنی نوعِ انسان کی طرح عقل و فہم کی صلاحیتیں رکھتے تھے۔ یہ صلاحیتیں ان کو عقل اور وجدان کے واضح تقاضے یاد دلاتیں، انہیں کائنات عالم کے گوشہ گوشہ میں پھیلی ہوئی آیاتِ فطرت پر اضطراراً متوجہ کرتیں اور وہ رہ رہ کر ان کے اندر قیامت کا بھیانک چہرہ دیکھنے پر مجبور ہو جاتے۔ دوسری طرف جانوروں کے سے غیر ذمہ دارانہ طرزِ زندگی کا عشق زور دیتا کہ اس دیکھی ہوئی حقیقت کو ان دیکھی بنا دے اور پھر جب قرآن اپنے تیز و تند لہجے میں انکارِ قیامت پر ان کی سرزنش کرتا تو جوشِ مخالفت

میں ان کا پہلا احساس بالکل ہی مضمحل ہو جاتا اور دوسرا پوری طرح اُبھر آتا، اور ایسے قطعی انداز میں امکانِ قیامت کی مخالفت بن کر نمودار ہوتا، گویا اس معاملہ میں وہ انتہائی بصیرت اور اطمینان رکھتے ہیں۔ آخر مخالفت کے جوش میں آدمی کے مُنہ سے کیا کچھ نہیں نکلا کرتا!

غرض یہ ایک حقیقت ہے کہ وقوعِ قیامت اور جزائے اعمال کا تصوّر ایسا عقلی اور فطری تصوّر ہے کہ منکرینِ قیامت بھی اپنے دلوں سے اس کی خلش نہ نکال سکے، دوسروں کا کیا کہنا۔ یہی وجہ ہے کہ فکرِ آخرت سے بے نیازی کے باوجود انسان اس سے مکمّل بے نیاز نہیں ہو سکتا، اور اس آنے والی گھڑی کے لیے اسے کچھ نہ کچھ سوچنا ہی پڑتا ہے۔ کیا سوچتا ہے؟ یہ ایک دلچسپ سوال ہے اور فکری اور عملی طور پر مختلف قسم کے لوگوں نے اس کے جو جوابات دیے ہیں وہ اس سے بھی زیادہ دلچسپ ہیں:۔

(۱) جو لوگ علانیہ منکرین کے زمرہ میں شامل ہیں وہ یوں سوچتے ہیں کہ:۔

(۱) وَمَآ اَظُنُّ السَّاعَةَ قَآئِمَةً وَّلَئِنْ رُّدِدْتُّ اِلٰى رَبِّىْ لَاَجِدَنَّ خَيْرًا مِّنْهَا مُنْقَلَبًا (کہف)	میرا گمان تو یہ نہیں ہے کہ قیامت آنیوالی ہے۔ لیکن اگر (ایسا ہوا اور) میں اپنے رب کے حضور لوٹایا گیا تو یقیناً وہاں اس دنیا سے بھی بہتر مقام پر سرفراز ہوں گا

گویا جب نفس کی یہ مرغوب ترین خواہش، کہ اعمال کا محاسبہ نہ ہو، اپنا

پورا زور دکھانے کے باوجود عقل و فطرت کے تقاضوں سے اندر ہی اندر شکست کھانے لگتی ہے تو وہ ایک دوسرا راستہ تلاش کرتی ہے اور اپنا دامِ فریب لیے ہوئے براہِ راست انسان کے قوائے فہم و عقل کے پاس پہنچتی ہے، اور کوشش کرتی ہے کہ وہ اپنے آپ کو اس دام کے حوالہ کر دے، اس کا آلۂ کار بن جائے، اس کے غیر معقول اور خلافِ حقیقت مقاصد کو استدلال کی قوت نہیں تو اس کا رنگ ضرور دے دے، تاکہ اس فطری خلش کو بہلا دیا جا سکے جو انسانی فطرت کی گہرائیوں میں محاسبۂ اعمال کے متعلق موجود ہے۔ ادھر انسان کے قوائے فکر و نظر کا یہ حال ہے کہ اگر خدا پرستی کی روشنی اور ایمان کا نور ان کی رہنمائی نہ کرے تو وہ بہت جلد غلط راہوں پر جا بھٹکتے ہیں اور نامعقول سے نامعقول افکار و نظریات کا شکار ہو رہتے ہیں۔ منکرِ آخرت کا اندازِ فکر ایک ایسا ہی محروم انوار اندازِ فکر ہے۔ چنانچہ جب فطری، وجدانی اور عقلی دلائل نے قیامت کا تصوّر خواہی نخواہی سامنے کر ہی دیا تو اس نے اپنے قوائے فکر کو اشارہ کیا اور تعمیلِ حکم میں انہوں نے ایک ایسا فلسفہ تیار کر دیا جس کے سہارے آخرت کو دیدۂ بصیرت سے دیکھ لینے کے باوجود اس کو اس کے تمام اندیشوں سے نجات مل گئی، اور عقل و استدلال کی سند کے ساتھ مل گئی۔ انہوں نے اسے سمجھایا کہ اگر قیامت آئی بھی تو تمہیں کیا غم؟ اس وقت بھی تمہارے لیے عیش ہی عیش ہوگا، کیونکہ تم پر اللہ کی نظرِ کرم ہے۔ اس بات کا ثبوت کہ تم پر اس

کی نظر کرم ہے، یہ ہے کہ تم آج دنیا میں خوش حال ہو۔ ورنہ اگر تم سے اللہ تعالیٰ ناراض ہوتا تو اس طرح تم پر اپنی نعمتوں کی بارش کیوں کرتا؛ کہیں اپنے دشمن اور مبغوض کے ساتھ بھی ایسا سلوک کیا جاتا ہے؛ غور فرمائیے کہ بات کس طرح بن گئی، اور نفس کو کیسی تسلّی مل گئی! خواہش نفس اور حُبّ دنیا نے اس کی عقل سے کہا بس ذرا دیر کے لیے ایک حقیقت سے آنکھیں میچ لو، اور اس مسئلہ پر غور کرتے ہوئے درمیان میں چند لمحوں کے لیے معقولیت پسندی پر اصرار چھوڑ دو، یعنی کائنات کے سارے اسرار پر جو کھول کر داد فکر و تحقیق دو مگر بنی آدم کی دنیوی زندگی میں جو حکمتِ ابتلا، کام کر رہی ہے، اسے بھول جاؤ، پھر ہیرا کام بنا جاتا ہے۔ اب مجھے کوئی لاکھ سمجھائے کہ اس دنیا کے اندر کام کرنے والے قوانین دوسرے ہیں اور اس عالم میں دوسرے ہوں گے، یہاں رزق کا معاملہ اتباعِ حق اور پیروی باطل کی بحث سے جدا ہے اس لیے دنیوی خوش حالی کو اللہ کے تقرب کی نشانی اور دلیل نہ سمجھ، مگر مجھے اس کی کوئی پروا نہیں ہو گی اس لیے کہ میرے پاس اس کے خلاف "عقلی استدلال" کی ڈھال ہو گی۔

ظاہر ہے کہ یہ سوچنا کوئی سوچنا نہیں، بلکہ ایک فریب مصالحت ہے جو فطرتِ انسانی کی اندرونی خلش کو دبانے کے لیے عیش دُنیا کا پرستار اور مادی مفاد کا دلدادہ نفس اختیار کرتا ہے۔ اس طرح وہ دونوں متضاد میلانوں

میں مصالحت کرانا چاہتا ہے، پھر یہ مصالحت بھی بڑی ہی عجیب و غریب طرح کی مصالحت ہوتی ہے۔ اس میں عام دستورِ مصالحت کے خلاف صرف ایک ہی فریق کو اپنی جگہ چھوڑنی پڑتی ہے اور فریقِ ثانی اپنی جگہ سے ایک انچ بھی نہیں کھسکتا۔ قیامت اور جزائے اعمال کے فطری احساس کو جب یہ کہہ کر تھپکیاں دی جائیں گی کہ تمہارا وجود بالکل برحق ہے مگر اسی کے ساتھ یہ بات بھی برحق ہے کہ میری دنیوی خوش حالی دراصل میری اُخروی خوش حالی کی سند ہے" تو اس اقرارِ قیامت کی سرحدیں انکار کی سرحدوں سے حقیقتاً کتنی دور ہوں گی؟

(ب) لیکن، قصہ یہ ہے کہ اس دامِ فریب کے تار کچھ اتنے مضبوط نہیں ہیں کہ احساسِ فطرت کی اضطرابی کروٹیں انہیں توڑ نہ سکیں، اس لیے نفسانیت زدہ عقل نے ایک اور جال بن کر فراہم کیا۔ اس نے کہا "قیامت کے انکار پر اصرار کی ضرورت نہیں، مان لو کہ وہ آ ہی جائے گی، مگر اسی کے ساتھ یہ "حقیقت" بھی تمہارے لیے سکینتِ خاطر کا موجب ہونی چاہیے کہ انسان کی مغفرت اس کے اپنے اعمال کے پیشِ نظر نہ ہوگی بلکہ دراصل ان بلند مرتبت ہستیوں کی سفارش پر ہوگی جن کو کارِ بارِ خدائی میں درخور حاصل ہے، خواہ براہِ راست حقوقِ خدائی میں شریک ہونے کی حیثیت سے، خواہ بارگاہِ خداوندی میں ایسا مقرب ہونے کی وجہ سے جس کی بات ٹالی نہ جا سکے۔ اب تمہارا کام صرف یہ ہے کہ ان بہت ساری ہستیوں میں سے کسی ایک کا دامن پکڑ لو، اس

کی تعریفیں کرو، اس کی عقیدتوں کے گیت گاؤ، اس کے تھان یا اس کے مزار پر والہانہ انداز میں سجدے کر لیا کرو، اس کے حضور اپنی نذریں اور التجائیں پیش کرو ـــــــ پھر اس کے بعد تم آزاد ہو کہ زندگی میں جو چاہو کرو، اب دنیا اور دین دونوں کی سعادت مندیاں تمہارے لیے بالکل یقینی ہیں"۔ مشرکین عرب، جن کے انکارِ قیامت کی شدت کا حال کسی پر مخفی نہیں، اس انکار کے ساتھ یہ عقیدہ رکھتے تھے کہ:۔

هٰؤُلَاۤءِ شُفَعَاۤؤُنَا عِنْدَ اللّٰهِ (یونس۔ آیت ۱۹) یہ ہمارے معبود دراصل، اللہ کے حضور ہمارے سفارشی ہیں۔

"اللہ کے حضور سفارشی ہیں" کے الفاظ بتاتے ہیں کہ دل کی گہرائیوں میں آخرت کی بازپرس کا اندیشہ بہرحال کھٹک رہا ہے، اور خودساختہ معبودوں کی پرستش اور بندگی اختیار کرنے کی اہم ترین وجہ یہی ہے کہ اپنے زور اور رسوخ سے لوگوں کو لازماً بخشوا دیں گے۔

اعتراف کرنا چاہیے کہ نفس کا یہ داؤ پہلے داؤں سے زیادہ کارگر ہے اور اس کے دامِ فریب کے تار اتنے بودے نہیں ہیں کہ عقل و فطرت کا کوئی کمزور احساس انہیں آسانی سے توڑ سکے۔ فرشتوں نبیوں، ولیوں اور بزرگ انسانوں کے ساتھ عقیدت کی جڑیں دلوں میں بڑی گہری اتری ہوئی ہوتی ہیں، بسا اوقات اتنی گہری کہ اگر آپ توحیدِ خالص کا نظریہ

لوگوں کے سامنے پیش کریں اور انہیں بتائیں کہ یہ سارے کے سارے اللہ کے سامنے بندۂ مجبور ہیں، یہ کوئی طاقت نہیں رکھتے، ان کی شفاعت کسی ایسے شخص کو ہرگز نہ بچا سکے گی جو اللہ تعالیٰ کے قانون جزا کے مطابق سزا کا مستوجب ہو گا، اور حق تو یہ ہے کہ وہ ایسے کسی شخص کی شفاعت کریں گے ہی نہیں اور نہ کر ہی سکیں گے، تو آپ کی یہ ساری باتیں ان کے نزدیک بداعتقادی، گستاخی اور بے دینی پر محمول ہوں گی، ان کے نقطۂ خیال کے مطابق آپ ایسا کہہ کر مقربین خدا کی توہین کے مرتکب ہوں گے، اور یہ ان کی "دینداری" کا شدید ترین تقاضا ہو گا کہ آپ کی باتوں کو ٹھکرا دیں، ان کی مخالفت کریں، ان پر نفرین بھیجیں، اور ان کی "ناپاک" بھنک سے بھی اپنے کانوں کو محفوظ رکھیں۔

اگر کبھی آپ کو ایسی ذہنیتوں سے سابقہ پڑا ہو گا تو آپ جانتے ہوں گے کہ نفسیاتی طور پر یہ معاملہ کتنا نازک بن جاتا ہے، اور ایسے مواقع پر مشرکوں یا مشرک "موحدوں" کے جذبات کس طرح بھڑک اٹھتے ہیں۔ ان کے بھڑکنے کا انداز کچھ ایسا ظاہر فریب ہوتا ہے کہ گویا یہ "سچی" دینداری اور پختہ عقیدگی ہی ہے جو انہیں جلالِ حق سے بے تاب کر رہی ہے اور بدعقیدگی کے خلاف اشتعال دلا رہی ہے۔ مگر دراصل صورت معاملہ کچھ اور ہی ہوتی ہے۔ "حمایت حق" کی اس سطح کے اندر، گہرائیوں میں جو حقیقت موجود ہوتی ہے ان کا انہیں غالباً بسا اوقات خود بھی احساس نہیں ہوتا، کیونکہ وہ غلط فہمیوں، خوش گمانیوں، بداعتقادیوں اور جہل کی تراشی ہوئی تاویلوں کے

بوجھ سے دب جاتی اور شعور سے نکل کر لاشعور میں جا چھپی ہوتی ہے۔ اصل مقصد تو یہ ہوتا ہے کہ بندگی کی ہمہ گیر ذمہ داریوں سے بچا جائے اور مفاد دنیا کی پوجا میں کہیں سے رخنہ اندازی نہ ہونے پائے، لیکن نام لیا جاتا ہے مقربین بارگاہ کی عظمت واحترام کا۔ چونکہ ایسے لوگ بے قید زندگی بسر کرنے کے حریص ہوتے ہیں، اور اس مقصد کے حصول میں قیامت اور جزائے عمل کے اندیشے کا فطری احساس زبردست روک ثابت ہوتا ہے، اس لئے اس کو اس افیون کا انجکشن دے کر ماؤف کر دینے کی یہ کامیاب کوشش کی گئی، یعنی اسے باور کرایا گیا کہ فکر اور پریشانی کی کوئی بات نہیں، ان بزرگ ہستیوں کی موجودگی میں سزا اور تعزیر کا کوئی سوال ہی نہیں پیدا ہوگا۔

جیسا کہ اوپر عرض کیا گیا یہ فریب مصالحت پہلے سے زیادہ موثر اور زور دار نکلا، اور اندیشۂ آخرت کے لیے یہ لوریاں بڑی ہی خواب آور ثابت ہوئیں۔ دراصل اس میں جو نفسیاتی نزاکتیں ہیں ان کے ہوتے ہوئے ایسا ہی ہونا بھی چاہیئے تھا، اور اگر انسان کے عقلی اور فطری احساسات اس فریب کے اسیر بن جائیں تو یہ چنداں قابل حیرت نہیں۔ چنانچہ دنیا کی اکثریت بالعموم اسی دام کا نخچیر بنتی رہی ہے اور شاید آج بھی ہے۔

(۲) یہ تو ان لوگوں کا "سوچنا" تھا جو بظاہر علانیہ منکرین قیامت ہوتے رہے ہیں۔ اب ذرا ان لوگوں کے سوچ بچار کا بھی جائزہ لے لینا چاہیئے جو ایمان

بالآخرت کے مدعی ہوتے ہیں، لیکن ساتھ ہی گردن دنیا پرستی کے عفریت کے چنگل میں دبی ہوتی ہے۔ دیکھنا چاہئے کہ یہ لوگ اپنی مشکل کا حل کیا نکالتے ہیں اور ان دونوں متضاد حقیقتوں میں مصالحت کی کیا صورت پیدا کرتے ہیں۔

اس ضمن میں یہ بات پہلے ہی سے مان لینی چاہیے کہ مصالحت کا انداز اس گروہ کے ہاں بھی بعینہ وہی ہوگا جو پہلے گروہ کے یہاں ہے، اور اس کا مقصود اس کے یہاں بھی صرف یہی ہوگا کہ عملاً فکر و ایمانِ آخرت کو معطل کر دیا جائے اور ہرگز اس کا کوئی دباؤ اپنے طرزِ فکر اور طریق عمل پہ نہ پڑنے دیا جائے؛ یہاں تک کہ نفس کی بے لگام خواہشوں کو کھلی چھٹی مل جائے۔ حالات کا جائزہ لیے بغیر پہلے ہی سے اس قسم کی رائے قائم کر لینا نہ تو کوئی علمی غلطی ہے نہ ہی اس گروہ کے حق میں کوئی ناانصافی۔ اس لیے کہ اگر انسان کے اندر اتباعِ شہوات کا ہوکا نہ اُٹھے تو مصالحت کی نامبارک سعی کی اسے ضرورت ہی نہ ہوگی، اور جب تک اس اتباعِ شہوات میں اس کا نفس اس کی کوششوں پہ اظہارِ اطمینان نہ کر دے اس وقت تک وہ اپنے قدموں کو روک نہیں سکتا اور یہ کوئی راز نہیں ہے کہ نفس کو اطمینان کب ہوتا ہے؟ آیا اس وقت، جب کہ فکرِ آخرت فکرِ دنیا پر غالب رہتی ہے، یا اس وقت، جب کہ اس سے پوری طرح مغلوب ہو چکی ہوتی ہے؟

اب ہمیں واقعات کی سند کے ساتھ یہ دیکھنا ہے کہ وہ کون سے اور کس نوع کے خانہ ساز نظریات ہیں۔ جن کے بل پر یہ گروہ ایمان بالآخرت کو،

اور اسی کے ساتھ ساتھ عقیدۂ توحید کو بھی زندہ درگور کرتا ہے۔ اس باب میں اگر ہم بنی اسرائیل کی تاریخ دیانت کو سامنے رکھ لیں تو غالباً اپنی منزل مقصود تک پہنچنے کا قریب ترین اور کامیاب ترین راستہ اختیار کریں گے، کیونکہ یہ وہ قوم ہے جس نے اس مہم کو بڑی "کامیابی" کے ساتھ سر کیا ہے اور اس معاملہ میں اس کی جرأت بیباک ذرا مشکل ہی سے اپنی کوئی نظیر رکھتی ہوگی۔ اس نے قیامت کو زبانی طور سے ماننے اور عملی طور پر نہ ماننے کا کام بڑی خوبی سے انجام دیا ہے۔ اس کا "ایمان" تھا کہ یوم جزا آنے والا ہے مگر اسی کے ساتھ وہ یہ بھی سمجھتی تھی کہ ہمارے لیے ترک و اختیار کی ہر راہ کھلی ہوئی ہے اور قیامت کا یقینی وجود ہم سے ہماری آزادی فکر و عمل پر کسی بندش کا طالب نہیں۔ کیوں؟ اس لیے کہ:-

(ا) ہم اللہ کے لاڈلے اور چہیتے ہیں (نَحْنُ اَبْنَآءُ اللّٰهِ وَاَحِبَّآؤُهٗ) (مائدہ-۳۰) اور ہمارا اگروہ یہودیت میں ہونا اس امر کی ضمانت ہے کہ ہم بہرحال برسر ہدایت ہیں، خواہ ہمارے اعمال کچھ ہی کیوں نہ ہوں (قَالُوْا كُوْنُوْا هُوْدًا اَوْ نَصٰرٰى تَهْتَدُوْا) (بقرہ)

(ب) بنا بریں وہ ہمیں ضرور بخش دے گا (سَيُغْفَرُ لَنَا - اعراف، ۲۱) یا اگر اس نے کچھ سرزنش کی بھی تو وہ گنتی کے دنوں سے زیادہ نہ ہوگی۔ (لَنْ تَمَسَّنَا النَّارُ اِلَّآ اَيَّامًا مَّعْدُوْدَةً)

یہ نظریات انہوں نے کیوں گھڑے؟ وہ کون سا محرک تھا جس نے انہیں اس طرح سوچنے پر مجبور کیا؟ کیا ان کی کتاب (تورات) نے انہیں یہ نقاطِ نظر دیئے تھے؟ نہیں، ہرگز نہیں، حاشا وکلّا، خدا کا کلام ان خرافات سے بالکل بری ہے چنانچہ قرآن نے ان پر صاف لفظوں میں یہ الزام رکھا کہ یہ سب تمہارے نفس کی خواہشیں (امانی) ہیں، جن کا اللہ کی کتاب سے کوئی تعلق نہیں۔ پھر یہ نادر "حقائق" کہاں سے ان کے ہاتھ لگے اور ان خواہشوں کو انہوں نے حقیقت کا جامہ کیوں پہنا رکھا تھا؟ اس کے جواب کے لیے ان کی ذہنیت، سیرت اور کردار کی ان تفصیلات پر ایک سرسری نظر ڈال لینا کافی ہے جو ان کی فردِ قرار دادِ جرم کی حیثیت سے قرآن نے پیش کی ہے، اور ان کا مغز قرآن کے اس دو لفظی تبصرے میں موجود ہے

وَلَتَجِدَنَّهُمْ أَحْرَصَ النَّاسِ عَلَىٰ حَیٰوۃٍ وَمِنَ الَّذِیْنَ اَشْرَکُوْا۔ (بقرہ)

تم ان (یہودیوں) کو حیاتِ دنیا کا سب سے بڑا حریص پاؤ گے یہاں تک کہ اس معاملہ میں وہ مشرکوں سے بھی آگے نظر آئیں گے۔

اس مختصر اور جامع تبصرے کی تفصیل آپ خود اسی سورۃ (بقرہ) کے اندر دیکھ سکتے ہیں، اور اس کے علاوہ اور سورتوں کے اندر بھی مگر حقیقت یہ ہے کہ یہ مختصر سا جملہ اس باب میں خود ہی پوری طرح کفایت کرتا ہے اور ہر طرح کی شرح و تفصیل سے یکسر بے نیاز ہے۔

پھر اس معاملہ میں یہ بات بھی ناقابلِ تردید ہے کہ اس انقلابِ فکر و نظر کی وجہ کوئی اتفاقی حادثہ نہیں ہے، نہ ہی اس کی طبعی ترتیب یہ ہے کہ ان یہودیوں کو بندگی کی ذمہ داریاں بتائی نہ گئی تھیں، یا یہ کہ حقیقت کا سراغ ان پر گم ہو گیا تھا اور انہیں یہ ذمہ داریاں یاد نہ رہی تھیں، پھر کچھ اتفاقی اسباب

ایسے پیدا ہو گئے جنہوں نے ان کے ذہنوں کو اپنی محبوبیت اور مغفوریت کے باطل پندار میں مبتلا کر دیا، .... جس کے بعد وہ پابندیٔ شرع سے بے پروا ہو گئے۔ بلکہ واقعات کی منطقی ترتیب بالکل الٹی ہے، یعنی پہلے انہیں دنیوی زندگی نے اپنا گرویدہ بنایا، اس کے بعد انہوں نے اپنی مغفرت کا عجیب و غریب "فارمولا" ایجاد کیا۔ اور اس ایجاد کی ضرورت اس لیے پیش آئی کہ "بدقسمتی" سے ان کو ایک یوم جزا کے آنے کا اعتراف تھا، اس اعتراف کا تقاضا تھا کہ وہ اپنی مادی خواہشوں پر سخت پابندیاں عاید کریں، اور حرص دنیا کو چھوڑ دیں، کیونکہ دنیا کی بندگی کے ساتھ ساتھ خدا کی بندگی ممکن نہیں، اس لیے کھلم کھلا دنیا کی پوجا اور آخرت سے بے نیازی ممکن نہ تھی، اور لازماً یہ سوال سامنے آکھڑا ہوا کہ آخرت کے تقاضوں پر کان دھریں یا مفادِ نفس کو دیکھیں؟ آخر اللہ نے عقل کے ناخن دیے تھے، جن سے انہوں نے اس مشکل گرہ کو کھول ہی لیا، اور کہا دونوں تقاضے اور دونوں زندگی کے مفاد اپنی جگہ درست اور قابل لحاظ ہیں اور ان میں —— ہماری ذات کی حد تک —— کوئی تضاد نہیں۔ قیامت آئے گی، حساب کتاب کا ہونا بالکل برحق ہے، مگر ہم اسرائیل کی اولاد ہیں، انبیاء کے بیٹے ہیں، اگر اللہ تعالیٰ کے ساتھ اس خانوادۂ اسرائیلی کو کوئی خصوصیت نہ تھی، تو دین و دنیا کی ان اعلیٰ ترین نعمتوں اور فضیلتوں —— نبوت اور حکومت —— کی اسی کے اندر کیوں ارزانی فرمائی گئی! یقیناً ہم پیدائشی جنتی ہیں، اور ہمارا گروہ امتِ مرحومہ

کا گروہ، اور ہمارا دائرہ نجات کا دائرہ ہے جب ہمارے باپ دادا، ابراہیمؑ اسحاقؑ، یعقوبؑ، یوسفؑ، موسیٰؑ اور ہارونؑ صلوٰت اللہ علیہم اجمعین جیسے مقربینِ بارگاہِ الٰہی ہیں تو ان کے ہوتے ہوئے حیف ہے اگر ہم سے عام لوگوں کی طرح حساب کتاب لیا گیا۔"

اب گہری نظر سے ان کے اس اندازِ فکر کا تجزیہ کر دیکھیے، بات کچھ بہت زیادہ مختلف نہ نکلے گی اور اس کی اصل بھی وہی نظر آئے گی جو اصل کہ پہلے گروہ کے زاویہ نگاہ کی تھی، یعنی بزرگ ہستیوں کی قطعی شفاعت کا خود تراشیدہ عقیدہ۔ فرق اگر کچھ ہے تو صرف یہ کہ پہلا گروہ اس قسم کی ہستیوں کو صرف شریک خدائی یا خدا کا مقرب ہی نہیں کہتا تھا بلکہ صاف گوئی اور جرأت سے کام لیتے ہوئے انہیں اپنا معبود بھی تسلیم کرتا تھا اور ان کے نام پر پتھر کے مجسمے بنا کر علانیہ اور فخریہ ان کی پوجا بھی کیا کرتا تھا، مگر چونکہ انہیں توریت کے لفظوں کی ذرا لاج بھی رکھنی تھی، اس لیے زبان کی حد تک تو ایسا کہنے سے، اور عبادت کے معروف معنوں میں ان کی بندگی اور پوجا کرنے سے مجتنب رہے۔ لیکن بایں ہمہ عقیدہ و عمل کی وہ کون سی گمراہی تھی جو مشرکوں اور قیامت کے منکروں میں پائی جاتی ہو، اور اس سے ان کا دامن بالکل پاک رہا ہو! قرآن نے ان پر کون سا الزام نہیں لگایا! اس نے صاف طور سے ان کے دلوں کو شرک کی ناپاکی سے ملوث بتایا، اور انہیں مشرکوں کے سے عقیدۂ شفاعت کا الزام دیا۔ ان سے جو بار بار

یہ فرمایا گیا کہ :۔

"اے بنی اسرائیل! اس دن سے ڈرو جس دن کوئی شخص کسی دوسرے کی طرف سے ذرّہ برابر بھی ذمہ دار نہ بنے گا، نہ اس کے باب میں کوئی سفارش سنی جائے گی، نہ فدیہ قبول ہوگا، اور نہ کہیں سے انہیں مدد پہنچے گی۔ (بقرہ) تو اس کا مطلب اس کھلی ہوئی تعریض کے سوا کیا تھا کہ تم اپنے بزرگوں کی شفاعت پر نظریں جمائے بیٹھے ہو، حالانکہ اس کی حیثیت سراب سے زیادہ نہیں۔ بغور فرمائیے اس قسم کا نظریۂ شفاعت کیا کم و بیش ویسا ہی عقیدہ شفاعت نہیں ہے جس کے بل پر مشرک قومیں اطمینان سے دنیا کی پرستش میں مصروف رہتی ہیں، اور جس کے ساتھ ایمان بالآخرت بالکل بے معنی ہو کر رہ جاتا ہے، بلکہ نفس قیامت کے وقوع ہی کی کوئی عقلی ضرورت نہیں باقی رہ جاتی۔

یہاں پہنچ کر آخر میں ہمارا ذہن قدرتی طور پر ایک اور سوال کرتا ہے، اور وہ یہ کہ پہلا گروہ تو کھلم کھلا منکرین قیامت کا گروہ کہا جاتا ہے، اس لیے کہ اس کو اپنے بارے میں یہی لقب پسند تھا اور اس نے دنیا کے سامنے اپنے کو اسی حیثیت سے پیش بھی کیا، یہ دوسری بات ہے کہ ان کا دل قطعی طور سے منکر نہ تھا بلکہ فی الواقع متردد تھا، لیکن اس دوسرے گروہ کی پوزیشن کیا ہے، جب کہ زبان کی حد تک اسے اپنے عقیدۂ آخرت پر شدت سے اصرار ہے؟ بلاشبہ دنیا کا قاضی، جو دلوں کا حال نہیں جانتا، ایسوں کو ہرگز منکرِ آخرت قرار نہیں دے سکتا،

لیکن کیا یوم جزا کا قاضی بھی یوں ہی فیصلہ کرے گا؟ قرآن کہتا ہے کہ نہیں ایسا نہیں ہوگا یہ قاضی ایسوں کے بارے میں کل جو کچھ فیصلہ کرنے والا ہے، اُس کا حال تو کل ہی کھلے گا، لیکن آج اس دنیا میں بھی اس کا فیصلہ کچھ زیادہ چھپا ہوا نہیں ہے۔ اس کے کلام ——— قرآن مجید ——— میں جو تنقیدیں ان اسرائیلیوں کے اعمال و افکار پر کی گئی ہیں ان کے اندر صاف طور سے اس امر کی غمازی موجود ہے کہ ان کا دعویٰ ایمان بالآخرت اللہ تعالیٰ کو تسلیم نہیں اور اس کی نگاہ میں ان کے زبانی اقرار کا پلڑا عملی انکار کے پلڑے سے کسی طرح بھی جھکا ہوا نہیں ہے۔ قرآن کے پہلے ہی صفحے پر نظر ڈالیے، سورہ بقرہ کی، جس کا تخاطب یہود کی طرف ہے، ابتدائی آیتیں آپ کے سامنے ہوں گی۔ ان آیتوں میں اس امر کا دعویٰ کیا گیا ہے کہ جس آخری کتاب اور نبوت کا تورات اور انجیل میں وعدہ کیا گیا تھا، وعدہ نہیں بلکہ جس کی بشارت دی گئی تھی اور جس کے ظہور کے لیے تم سراپا اشتیاق اور ہمہ تن انتظار تھے، وہ یہی کتاب (قرآن) ہے، اس میں ذرہ برابر شک کی گنجائش نہیں۔ رہی یہ بات کہ تم باوجود شوق بے تابی کے اس پر ایمان کیوں نہیں لاتے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ ایمان کی دولت ایمان کے قدر دانوں اور مستحقوں ہی کو ملتی ہے۔ یہ مستحق وہ لوگ ہوتے ہیں جن کے دلوں میں تقویٰ ہو، اور تقویٰ کی کچھ لازمی صفات و علامات ہیں۔ پھر یہ صفات گنائی گئی ہیں اور سب سے آخری صفت، جسے بند کا مقطع کہنا چاہیے، یہ بیان کی گئی ہے کہ وَبِالْاٰخِرَةِ هُمْ يُوْقِنُوْنَ (یعنی متقی، قرآن سے ہدایت پا سکنے والے،

وہ لوگ ہوتے ہیں جن کو آخرت پر پختہ یقین ہو"۔ ادب عربی کا معمولی ادا شناس
بھی جانتا ہے کہ بِالْاٰخِرَةِ کے لفظ کا مقدم ہونا اور پھر "ھُمْ" کی ضمیر کا لانا کیا معنی رکھتا
ہے! کھلی بات ہے کہ اس میں یہودیوں کے ادعائے ایمان بالآخرت کو نہ
تسلیم کرتے ہوئے اس کے کھوکھلے پن پر واضح تعریض کی گئی ہے اور ان کے
اسی ام الامراض کی طرف انگلی اٹھائی گئی ہے جو ہدایت قرآنی سے ان کی
محرومی کا اصل سبب ہے۔ اسی طرح چند صفحے آگے چل کر جہاں ان کو براہ راست
خطاب کر کے قرآن پر ایمان لانے کا مطالبہ کیا گیا ہے، انہیں یہ وصیت فرمائی گئی ہے کہ
"راہ خدا پرستی طے کرنے کے لیے صبر اور نماز کا زادِ سفر ساتھ لے لو۔ (وَاسْتَعِيْنُوْا بِالصَّبْرِ
وَالصَّلٰوةِ) بلاشبہ منزل مقصود پر پہنچ جاؤ گے" مگر بات اتنے ہی پر ختم نہیں کر دی گئی
ہے بلکہ یہ بھی کہنا ضروری سمجھا گیا کہ یقیناً یہ نماز کسی بھی شخص کے لیے بہت شاق ہوتی
ہے۔ سوائے ان لوگوں کے جو دل میں اللہ تعالیٰ کا خشوع رکھتے ہیں جنہیں اس امر کا
یقین ہے کہ ایک دن اپنے رب سے ضرور دوچار ہونا پڑے گا (وَاِنَّهَا لَكَبِيْرَةٌ
اِلَّا عَلَى الْخٰشِعِيْنَ الَّذِيْنَ يَظُنُّوْنَ اَنَّهُمْ مُّلٰقُوْا رَبِّهِمْ) اس جملہ کا
حقیقی زور آپ پر اسی وقت واضح ہوگا جب ان کی یہ حالت بھی آپ کے سامنے
ہو کہ ان یہودیوں نے نماز ضائع کر دی اور اپنی لگام شہوات نفس کے ہاتھوں
میں دے رکھی ہے، "اَضَاعُوا الصَّلٰوةَ وَاتَّبَعُوا الشَّهَوٰتِ" دونوں آیتوں کو
ایک ساتھ رکھ کر دیکھیے تو حقیقت بے حجاب نظر آنے لگی کہ قرآن [illegible]

ایمان باالآخرت کو نہیں مانتا، وہ یہ تسلیم کرنے کے لیے تیار نہیں کہ مکافات عمل کا یہ یہودی اپنے اندر یقین اور اندیشہ رکھتے ہیں، کیونکہ ان کی زندگی کا سارا رویہ آخرت کے منکروں کا سا ہے اور ان کے زبانی دعویٰ کی صداقت پر وہ اپنے اندر کوئی ایک بھی وزنی دلیل نہیں رکھتا یہی وجہ ہے کہ قرآن انہیں بار بار جھنجوڑتا ہے اور کہتا ہے کہ تمہارے سینے خدا کے خوف سے کیوں خالی ہو گئے ہیں؟ کیوں نہیں ایسا ہوتا ہے کہ تم آخرت کی فکر کرتے (وَاتَّقُوا يَوْمًا لَا تَجْزِي الخ) دنیا کے خوف اور لالچ سے تو تمہارے دل اُٹے پڑے ہیں لیکن خدا کی دہشت اور محبت کا ان میں کوئی گذر نہیں حالانکہ خوف مجھ سے اور صرف مجھ ہی سے کھانا چاہیے تھا (وَإِيَّايَ فَارْهَبُونِ)

اس سلسلہ میں یہ بات مزید حیرت اور افسوس کے ساتھ سُنی جائے گی کہ خدا کے ان "لاڈلوں" اور جنت کے ان "اجارہ داروں" نے آخرش ایمان باالآخرت کی یہ ظاہری نمود بھی نہ باقی رہنے دی، اور ان کے دستِ تحریف نے نہ جانے کب اس نام نہاد عقیدہ آخرت کے خیالی اندیشوں سے بھی ان کے دماغوں کو مطمئن کر دینے کی کوشش کر ڈالی، یعنی اس وقت جو تورات ہمارے سامنے موجود ہے اس میں اس اہم ترین بنائے دین کی کوئی واضح تعلیم سرے سے ملتی ہی نہیں۔

جائزۂ احوال امت

اب ذرا دیر کے لیے اپنی دنیا میں آ جائیے، اور قبل اس کے کہ عقیدۂ آخرت کی تعمیری تدابیر پر غور و فکر شروع ہو، اس کا اندازہ لگا لیجئے کہ خود ہماری حالت ایمانی کیا ہے؟ آیا ہم اس زیغ نظر

اور فریب نفس سے محفوظ ہیں جس نے پچھلی قوموں کو "بے ایمان مومن" بنا ڈالا تھا، یا خدانخواستہ اس کے جراثیم ہمارے ذہنوں میں بھی گھس آئے ہیں؟ کیونکہ اس اندازے اور جائزے کے بغیر ہم تعمیر اور تعمیری تدبیروں کی اہمیت کا صحیح احساس نہیں کر سکتے۔

اگر یہ صحیح ہے کہ درخت اپنے پھل سے پہچانا جاتا ہے تو یقیناً یہ بھی صحیح ہے کہ ایمانی کیفیت کا اندازہ انسان کے اعمال و افکار ہی سے کیا جا سکتا ہے۔ خود ان یہودیوں کو، جن کی داستانِ آخرت فراموشی ابھی آپ نے سُنی، اس جرم کا مرتکب ٹھہرانے کے لیے اللہ تعالیٰ نے اپنے علم غیب کا حوالہ نہیں دیا ہے بلکہ خود ان کے اپنے طرزِ فکر اور طریقِ عمل کو بطور گواہ پیش کیا ہے۔ اسی طرح منافقوں کے معاملے کو لیجئے، کیا آپ کا یہ گمان ہے کہ اللہ تعالیٰ نے محض اس بنیاد پر انہیں منافق فرما دیا تھا کہ وہ ان کے دلوں کے اندر چھپی ہوئی نیاتوں کا علم رکھتا تھا، یا اس بنیاد پر کہ ان کے اعمال خود اپنی ہی زبان سے پکار پکار کر ان کے نفاق کا اعلان کر رہے تھے؟ قرآن میں پہلے خیال کی تائید آپ کو کہیں سے نظر نہ آئے گی، اس کے برعکس آپ کو اس میں اس طرح کے الفاظ ملیں گے۔

اَمْ حَسِبْتُمْ اَنْ تُتْرَكُوْا وَ لَمَّا يَعْلَمِ اللّٰهُ الَّذِيْنَ جٰهَدُوْا مِنْكُمْ (توبہ)	کیا تم نے گمان کر رکھا ہے کہ یوں ہی چھوڑ دیئے جاؤ گے، حالانکہ ابھی تک تو اللہ نے جانا ہی نہیں کہ تم میں سے کون راہِ حق میں جہاد کرنے والے ہیں۔

...... فَلَيَعْلَمَنَّ اللّٰهُ الَّذِيْنَ صَدَقُوْا وَلَيَعْلَمَنَّ الْكَاذِبِيْنَ (عنکبوت)

...... پس اللہ ضرور ان لوگوں کو جان کر رہے گا جو اپنے دعوائے ایمان میں سچے ہیں اور انہیں بھی جان کر رہے گا جو اس دعوے میں جھوٹے ہیں

کیا یہ گمان ایک لمحہ کے لیے بھی کیا جا سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کو فی الواقع ان کے ایمان کا حال معلوم نہ تھا؟ وہ نہیں جانتا تھا کہ کون سچا مومن ہے اور کون جھوٹا، ریاکار اور منافق؟ پھر اس ارشادِ الٰہی کا مطلب کیا ہوا کہ "اللہ نے جانا ہی نہیں" یا یہ کہ "اللہ ضرور جان کر رہے گا" ظاہر ہے اس کا مطلب اس کے سوا کچھ نہیں کہ نفاق کا جو کھوٹ ان کے دل کی گہرائیوں میں چھپا ہوا ہے اسے آزمائش کی بھٹی میں تپا کر باہر لایا جائے۔ تاکہ نافرمانی عمل کی سند سے یہ بات کھل کر سامنے آ جائے کہ ایمان کے فلاں فلاں مدعی جھوٹے ہیں، وہ دعوتِ ایمانی کے محاذ پر ہوتے ہوئے بھی اس کے دشمن ہیں، اس لیے ان کے دعوائے ایمان کی کوئی قیمت نہیں، کیونکہ ان کا عمل ان کے دعوٰی کے خلاف گواہی دے رہا ہے اور جب تک یہ گواہی اس [illegible] دعوائے ایمان کے حق میں نہ ہو جائے اس کا کوئی وزن نہیں تسلیم کیا جا سکتا۔ نہ تو اللہ کے حضور اور نہ ہی اس کے پیغمبر کے حضور اور نہ ہی عام مسلمانوں کے حضور۔ چنانچہ جب منافقوں کے ایک گروہ نے اپنی بے عملی پر اظہار تاسف کیا تو اللہ تعالیٰ نے ان سے فرمایا:

قُلِ اعْمَلُوا فَسَيَرَى اللّٰهُ عَمَلَكُمْ وَرَسُولُهُ وَالْمُؤْمِنُونَ ۔ (توبہ-۱۰۶)

اے نبی ان سے کہہ دو کہ تم عمل کا مظاہرہ کرتا، اللہ اور اس کا رسول اور سارے اہل ایمان تمہارے عمل کو دیکھیں گے، اور پھر اسی کے مطابق تمہارے ایمان کی بابت فیصلہ ہوگا۔

اسی طرح جب ایک جہاد کے موقع پر کچھ منافقوں نے جھوٹے بہانے کر کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے عدم شرکت کی اجازت لے لی تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے تنبیہ آئی:۔

لِمَ اَذِنْتَ لَهُمْ حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَكَ الَّذِيْنَ صَدَقُوْا وَتَعْلَمَ الْكٰذِبِيْنَ (توبہ-۳)

تم نے انہیں کیوں اجازت دے دی؟ تمہیں رکنا چاہیے تھا، یہاں تک کہ تم پر ان لوگوں کا حال روشن ہو جاتا جو ایمان کے دعوے میں سچے ہیں، اور تم جھوٹے مدعیوں کو جان لیتے۔

اگر وجود ایمان یا کیفیتِ ایمان کے باب میں عملی جائزے کا یہ اصول آپ کو تسلیم ہو، جیسا کہ تسلیم ہونا چاہیے، تو آیئے اپنے اعمال و افکار کا جائزہ لیں، اور یہ دیکھیں کہ ہمارے دعوائے ایمان پر ہمارے یہ اعمال و افکار کس رائے کا اظہار کرتے ہیں؟ شاید کوئی حقیقت پسند مسلمان جو اس رائے کے سننے سے انکار نہ کرے، ایک تلخ اور دل شکن صورتِ حال کا مشاہدہ کیے بغیر نہیں رہ سکتا۔ واقعہ یہ ہے یہ

ماننے پر مجبور کردیں گے کہ قرآن کی جن آیتوں میں بنی اسرائیل کی بدکرداریوں اور آخرت فراموشیوں کی روداد مذکور ہے وہ ایک بڑی حد تک مسلمانوں کے حال پر بھی چسپاں ہو رہی ہیں۔ وہ اس بات پر شکر اور اطمینان کا سانس تو لے سکے گا کہ اُمت مسلمہ بحیثیت مجموعی فکرِ آخرت سے بے نیازی کے اس مقام تک نہیں پہنچی ہے جہاں قوم یہود جا پہنچی تھی، مگر اس اعتراف سے وہ اپنے حساس اور مضطرب دل کو باز نہیں رکھ سکتا کہ اس امت کا ایک بڑا حصہ اپنے عمل سے کم و بیش انہی کیفیاتِ ذہنی کا مظاہرہ کر رہا ہے جنہوں نے بنی اسرائیل پر غضب الٰہی کی بجلیاں گرائی تھیں۔ انفرادی زندگی میں، اجتماعی معاملات میں، معاشرتی تعلقات میں، معاشی کاروبار میں، گھر میں بازار میں حتیٰ کہ مدرسہ و خانقاہ تک میں جو کچھ ہو رہا ہے اور برابر ہوتا رہتا ہے، اس کی تہ میں وہ اگر فکر فردا اور اندیشۂ آخرت کا کھوج لگائے گا تو پائے گا کہ اب مسلمانوں کی بھاری تعداد نے اس فکر اور اندیشے کو اپنے دلوں کے اندر بڑی ہی معمولی حیثیت دے رکھی ہے، اب یہ جو کام بھی کرنے اٹھتے ہیں اس کے دنیوی فوائد اور مصالح سوچنے میں تو اپنے اوپر خواب و خور حرام کر لیتے ہیں مگر فلاح آخرت کی فکر ان کے ذہنوں میں بار پانے کے لیے بس ایک اذن موہوم کا انتظار ہی کرتی رہتی ہے۔ اور اگر لاکھ آرزوؤں، خوشامدوں اور دعاؤں کے بعد یہ اذن حاصل بھی ہوتا ہے تو اس کی ایک اجنبی مسافر، یا زیادہ سے زیادہ ایک اجنبی مہمان کی حیثیت سے پذیرائی کی جاتی ہے، جس کی تکریم و ضیافت کے لیے "سَیُغْفَرُ لَنَا" اور

لَنْ تَمَسَّنَا النَّارُ اِلَّآ اَیَّامًا مَّعْدُوْدَۃً کے سوا کوئی اور شے مشکل ہی سے ملتی ہے وہ گمان کرنے لگ گئے ہیں کہ خواہ ہم کچھ ہی کیوں نہ کریں لیکن جب ہم مسلمان گھر میں پیدا ہو چکے ہیں تو بہرحال بخشش ہمارے لیے یقینی ہو چکی ہے، اور اللہ میاں ہمیں لازماً بخش دیں گے۔ اس قسم کے پندارِ باطل کا نشہ ایک کثیر تعداد کے دماغوں پر چھایا ہوا ہے، کسی میں اس کی تندی نمایاں ہے اور آنکھوں سے اس کا خمار ٹپکا پڑتا ہے، اور کسی میں ذرا پوشیدہ ہے اور خاص اوقات ہی میں اس کا اثر محسوس ہوتا ہے۔

ایسے برخود غلط لوگوں کو چھوڑ کر اُمت کا ایک حصہ ضرور ایسا ہے جس کے سامنے خوفِ آخرت ایک زندہ حقیقت بن کر موجود رہتا ہے، لیکن اس کی فکری اور عملی صلاحیتیں منتشر بھی ہیں اور بے وزن بھی، اس لیے اس کی موجودگی کا کوئی نمایاں اثر مسلمانوں کی قومی زندگی اور ان کے اجتماعی فکر و عمل پر پڑتا نظر نہیں آتا۔ نتیجہ یہ ہے کہ آخرت فراموشی، مادیت اور دُنیا پرستی کا دھارا جس طرح سارے عالم کو اپنی آغوش میں لیے ہوئے ہے، اسی طرح اس امت کی کشتیٔ حیات کو بھی کشاں کشاں اپنے رُخ پر بہائے لیے جا رہا ہے۔

شاید اس تلخ حقیقت کو تسلیم کرنے کے لیے ہمارا ذہن تیار نہ ہو، اس لیے کہ اپنے آپ کو بے عیب سمجھنا انسان کی جبلّت میں ہے، وہ دوسروں کے بخیے ادھیڑنے میں تو بڑا چابک دست ہوتا ہے، اور ان کے جرائم کا اندازہ

لگانے میں بڑا دیدہ ور بن جاتا ہے۔ مگر اپنے بارے میں اس کی ساری تیز دستی اور دیدہ وری دم بخود ہو کے رہ جاتی ہے، اور اس وقت وہ ہر ممکن رعایت سے کام لینے پر اصرار کرتا ہے۔ اس لیے اصل صورتِ حال کو عریاں کرنے کے لیے ضروری ہے کہ ایمان بالآخرت کے اس اصلی اور سب سے بڑے معیار کی طرف توجہ دلا دی جائے جو قرآن کا پیش کیا ہوا ہے، اور جس کا حوالہ بنی اسرائیل کے ذکر کے سلسلے میں اوپر آ بھی چکا ہے۔ یعنی یہ کہ "نماز کی اقامت ان لوگوں کے سوا اوروں پر بڑی ہی شاق ہوتی ہے جو دل میں اللہ کا خشوع رکھتے ہیں، جو اس امر پر یقین رکھتے ہیں کہ ہمیں اپنے رب سے ملنا ہے۔ (البقرہ ۵) کیا ان لفظوں میں اس بات کا اعلان نہیں ہے کہ نماز ہی ایمان بالآخرت کا معیار ہے؟ اگر اس امر واقعی سے آپ کو انکار نہیں ہے تو ذرا دل مضبوط کر کے اپنے حدود اربعہ کا جائزہ لے ڈالیے، اور دیکھیے کہ امتِ مسلمہ کا لقب رکھنے والی امت میں کے فی صد نماز پڑھنے والے ہیں؟ "نماز پڑھنے والے" نہ کہ "نماز قائم کرنے والے"۔ اس لیے کہ اس دوسری چھلنی میں ڈال کر اگر چھاننے کی جرأت کیجیے گا تو شاید اس کے باریک تر سوراخوں سے بہت ہی تھوڑا جوہر چھن کر نکلے گا۔ اسی طرح اگر آپ پچھلی بحثوں پر غور و فکر کی نگاہ ڈالیں گے تو ایمان بالآخرت کا ایک اور معیار ہاتھ آئے گا، اور وہ ہے دنیوی مفاد کی قربانی کا معیار۔ یہ بات اوپر کی سطروں میں تفصیل کے ساتھ آ چکی ہے کہ مومن اور منکر دونوں کے طرزِ فکر میں ایک بنیادی فرق بلکہ تضاد ہے۔

مومن آخرت کو دُنیا پر مقدم رکھتا ہے، لیکن منکر دنیا کو آخرت پر ترجیح دیتا ہے اور یہ دراصل مرغوباتِ نفس اور مفادِ دُنیا کی غیر معمولی کشش ہوتی ہے جو اس کو امورِ آخرت کی طرف سنجیدگی کے ساتھ متوجہ نہیں ہونے دیتی۔ اس لیے اگر آپ کو امت کے ایمان بالآخرت کی مجموعی کیفیت کا اندازہ لگانا ہو تو اس کسوٹی کو لے کر چاروں طرف گھوم آیئے، پھر آپ کو اپنے تجربہ اور احساس کی تلخی کا شکوہ تو ضرور ہو گا مگر اس جائزے میں تعدی کی شکایت غالباً باقی نہ رہے گی جو ابھی ہم نے لیا ہے۔

اس صورتِ حال پر کون صاحبِ دل ہو گا جو بے چین نہ ہو جائے گا۔ اور جب وہ ساتھ ہی یہ بھی دیکھے گا کہ آج اہلِ قرآن ان تیز و تند تنقیدوں سے کوئی خاص سبق نہیں لیتے جو قرآن نے اہلِ توریت کے افکار و اعمال پر کی تھیں، تو اس کی اس بے چینی کا کیا اندازہ کیا جا سکتا ہے! بنی اسرائیل نے اپنی نجات کا جو فلسفہ ایجاد کر رکھا تھا اس کی تردید میں قرآن نے کوئی ابہام نہیں رہنے دیا ہے۔ اور صاف فرما دیا ہے کہ یہ نظریات توریت اور انجیل کے پیش کردہ نظریات ہرگز نہیں ہیں۔ یہ تو ان کی آرزوؤں کے بطن سے نکلے ہوئے اوہام ہیں جن کی حیثیت سراب سے زیادہ نہیں۔ دُنیا و آخرت کی بہبودیاں ان خوش گمانیوں اور خواہشوں پر ہرگز منحصر نہیں، بلکہ ان کا انحصار تمام تر ایمان اور اعمال صالحہ پر ہے۔ یہی اللہ تعالیٰ کے یہاں فلاح و بخشش کا ایک متعین ضابطہ ہے۔ اگر فریب نفس میں پڑ کر انہوں نے اس ضابطۂ عدل کو معدوم سمجھ لیا تو اس سے واقعتہً

وہ معدوم نہیں ہو جائے گا۔ اس لیے اگر وہ اپنا بھلا چاہتے ہیں تو اس دامِ فریب سے انہیں نکلنا پڑے گا۔ یہ فہمائشیں آج بھی قرآن کے صفحوں میں درج ہیں، اور ہم ان کی روز ہی تلاوت کرتے ہیں۔ مگر بدقسمتی یہ ہے کہ ہم انہیں اور ان ہی طرح کی دوسری فہمائشوں اور تنقیدوں کو اس طرح پڑھتے ہیں جس طرح کسی غیر شخص کی فردِ قراردادِ جرم اور رودادِ مقدمہ کا مطالعہ کیا جاتا ہے۔ گویا ان سے ہماری دلچسپی محض تاریخی واقفیت کی حد تک ہے، ورنہ فی الواقع اس ساری داستان میں ہمارے اپنے لیے کوئی سامانِ عبرت و نصیحت نہیں۔ یہ اندازِ فکر و نظر بجائے خود کتنا غلط اور ناعاقبت اندیشانہ تھا، مگر ماتم تو اس بات کا ہے کہ یہ اندازِ فکر اس حال میں اختیار کیا گیا جب کہ پہلے ہی سے ہمیں اس کے خلاف متنبہ بھی کیا جا چکا تھا۔ ذرا اس تردید کے الفاظ ملاحظہ فرمایئے جو اہل توریت کے خود ساختہ نظریے کی بابت کی گئی تھی۔

لَيْسَ بِأَمَانِيِّكُمْ وَلَا أَمَانِيِّ أَهْلِ الْكِتَابِ مَنْ يَعْمَلْ سُوءًا يُجْزَ بِهِ ...... وَمَنْ يَعْمَلْ مِنَ الصَّالِحَاتِ مِنْ ذَكَرٍ أَوْ أُنْثَىٰ وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَأُولَٰئِكَ يَدْخُلُونَ الْجَنَّةَ الخ (نساء)

(مسلمانو!) فلاح و بخشش نہ تمہاری خواہشوں پر موقوف ہے نہ ہی ان اہل کتاب کی خواہشوں پر۔ ہمارے یہاں تو جو شخص بھی جو برائی کرے گا اس کا بدلہ پائیگا ...... اور جو کوئی بھی اچھے عمل کرے گا، خواہ وہ مرد ہو، یا عورت لیکن ہو وہ صاحبِ ایمان، وہ جنت میں داخل ہوگا۔

اِنَّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَالَّذِیْنَ هَادُوْا وَالنَّصٰرٰی وَالصّٰبِئِیْنَ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰہِ وَالْیَوْمِ الْاٰخِرِ وَعَمِلَ صَالِحًا فَلَهُمْ اَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ (البقرہ)	بلاشبہ چاہے مسلمانوں کا گروہ ہو، چاہے یہودیوں کا، نصاریٰ ہوں، خواہ صابئین ان میں سے جو شخص بھی اللہ اور آخرت کے دن پر ایمان لائے گا اور صالح اعمال کرے گا تو اس کے لیے اس کے رب کے پاس اجر (و بخشش) ہے

کیا ان آیتوں میں صرف اہل کتاب ہی مخاطب ہیں؟ کیا ان ہی کو یہ حقیقت ذہن نشین کرائی گئی ہے کہ انسان کی نجات کا انحصار اس کی اپنی خواہشوں کے گھڑے ہوئے تصورات پر نہیں ہے بلکہ توحید و آخرت کے سچے یقین پر، اور اس اصلاحِ عمل پر ہے جو اس یقین کی تہوں سے خود بخود ابھرتا ہے؛ نہیں اس تخصیص کی کوئی وجہ نہیں اس کے برخلاف آپ دیکھ رہے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے اپنا ضابطۂ عدل اور دستورِ مغفرت بیان کرتے وقت خود مسلمانوں کا نام سب سے پہلے لیا ہے۔ اور یہ ہمارے مہربان پروردگار کی کتنی بڑی کرم فرمائی تھی کہ اس نے اس اُمت کے لیے پہلے ہی سے وہ چور دروازہ بند کر دیا تھا جس میں سے ہو کر پچھلی اُمتوں پر گمراہی، ناخداترسی، خواہش پرستی، شریعت الٰہی سے بے توجہی احکام دین سے سرتابی اور اندیشۂ آخرت سے بے نیازی کے فتنے ٹوٹ پڑے تھے، اور باوجود اس کے کہ اس دورِ سعید میں مسلمانوں کے دل و دماغ اس گمراہ کن وہم کا کوئی ہلکے سے ہلکا پرتو بھی اپنے اندر نہیں رکھتے تھے۔ مگر چونکہ

انسانی نفسیات کے مدنظر آئندہ اس کا خطرہ بہرحال تھا اس لیے اللہ عزوجل نے پیش بندی کے طور پر انہیں بھی متنبہ فرما دیا، اور اگرچہ مقام نظریۂ یہود و نصاریٰ کی تردید کا تھا مگر صرف اتنا ہی کہہ دینے پر اس نے اکتفا نہ کر لی کہ یہ اہل کتاب اپنی بابت جو تصورِ نجات رکھتے ہیں وہ غلط ہے، بلکہ مسلمانوں کا شانہ پکڑ کر انہیں براہِ راست بھی یہ حقیقت سمجھا دی کہ "جس طرح مدارِ نجات یہودیت یا نصرانیت یا صابیت نہیں ہے اسی طرح "مسلمانیت" بھی نہیں ہے اس لیے ہوشیار رہنا اور ان یہودیوں اور عیسائیوں کی طرح کبھی تم بھی اس غلط فہمی کا شکار نہ بن جانا کہ ہمارا حلقہ 'ملی حلقۂ' نجات ہے، اس میں داخل ہوجانا ہی حسنِ عاقبت کی گارنٹی ہے۔ ورنہ جس طرح اس احمقانہ خوش گمانی نے آج ان یہود و نصاریٰ کو ڈبو رکھا ہے، اسی طرح کل تمہیں بھی لے ڈوبے گی" مگر انصاف سے کہیے ہم نے اس زبردست تنبیہ کا کہاں تک پاس رکھا؟ واقعات کی شہادت پوچھ رہے وہ تو یہ کہتی ہے کہ ہم نے اس سلسلہ میں سخت خطرناک غفلتوں کا ثبوت دیا ہے، اور قرآن نے ہمارے ایمان و عمل کے بچاؤ کے لیے جو بند باندھ رکھا تھا، اسے اپنے کارخانۂ منطق و کلام کی ڈھلی ہوئی گولیوں سے چھلنی کر ڈالنے میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ یہ امت بھی اندیشۂ عاقبت سے بے نیازی کے فتنوں سے محفوظ نہ رہ سکی اور انجام کار آج اس کے اندر ایمان باللہ اور ایمان بالآخرت، دونوں کی جڑیں ہل چکی ہیں۔ اور جب ایسا ہو چکا تو تعجب نہ

کرنا چاہیے اگر اس سے تقویٰ کی روح رخصت ہو چکی ہو، اگر اسے اپنا مقصد حیات فراموش ہو چکا ہو، اگر اس کے دماغ سے حق کے لیے جینے اور حق ہی کے لیے مرنے کا سودا نکل چکا ہو۔

اس صورتِ حال پر ہم جتنا ہی زیادہ غور کرتے ہیں، اتنا ہی زیادہ ہمیں یقین ہو جاتا ہے کہ ہمارے اندر گو دونوں ہی بنیادی ایمانیات متزلزل ہو چکے ہیں مگر ایمان بالآخرت پر ہماری غفلتوں نے زیادہ توجہ کی ہے۔ ایمان باللہ کا وجود ابھی اس حد تک مردہ نہیں، جس قدر کہ ایمان بالآخرت کا ہے بحیثیت مجموعی اگر امت کے ایمان باللہ کی روح کو خفتہ اور مضمحل کہا جائے تو اس کے ایمان بالآخرت کی روح کو بے حس اور مفلوج کہنا چاہیے۔ اور یہ ایک عجیب بات ہے کہ ان دونوں کا تناسب پچھلی تمام امتوں میں بھی یہی دکھائی دے رہا ہے۔ ہم قرآن میں جس قوم کا تذکرہ بھی پڑھتے ہیں اس کو خدا کا انکار کرتے ہوئے تو نہیں پاتے مگر قیامت کے معاملہ میں قریب قریب ہر قوم کی طرف سے اسی نوع کی حیرت کا اظہار دیکھتے ہیں کہ:۔

اَإِذَا مِتْنَا وَكُنَّا تُرَابًا وَّعِظَامًا ءَإِنَّا لَمَبْعُوثُونَ	کیا ہم جب مر جائیں گے اور مٹی اور ہڈیوں کی شکل میں تبدیل ہو جائیں گے تو کیا اس وقت دوبارہ
(مومنون)	پیدا کر کے اٹھائے جائیں گے؟

اور اگر بعض اقوام ایسی نکلیں بھی کہ انہوں نے قیامت کا اس جزم کے ساتھ

انکار نہیں کیا تو ان کا قیامت کا ماننا بھی اس انداز کا تھا کہ عملی اور نتیجہ کے اعتبار سے وہ نہ ماننے ہی کے برابر تھا۔ اب جب یہ ایک امر واقعہ ہے کہ ہر پیغمبر نے اپنی قوم کے دل و دماغ میں ایمان باللہ اور ایمان بالآخرت دونوں کی جڑیں جمانے کی ابتدا ہی سے کوشش کی اور آخر دم تک وہ ان جڑوں کو مضبوط سے مضبوط تر کرتا رہا، کیوں کہ یہی دونوں ایمانیات دین حق کے اصلی سنگ ہائے بنیاد ہیں، تو آخر اس کی وجہ کیا ہے کہ کسی پیغمبر کے جانے کے بعد جب اس کے پیروؤں میں گمراہی نے اپنا سر نکالا تو اس کا اولین ہدف ایمان بالآخرت ہی بنا؟ ایمان باللہ کا تو کلی استیصال اس نے کبھی نہیں کیا مگر ایمان بالآخرت کے بارے میں اس نے اس وقت تک اطمینان کا سانس نہیں لیا جب تک کہ لوگوں کے دماغ کے ایک ایک ریشے سے اس کے امکان کے تصور کو جڑ بنیاد سے کھود کر پھینک نہ دیا۔ خدا کے بارے میں تو وہ اس بات پر آ کر بالکلیہ راضی ہو گئی کہ "یقیناً خالق کائنات اور رب اعلیٰ وہی ہے مگر اس کے ساتھ ہی اس کے دربار میں بہت سی ہستیوں کو اقتدار یا ایک خاص طرح کا تقرب حاصل ہے، اور اس طرح یہ ہستیاں اس کی خدائی کے کاروبار میں ایک حد تک دخیل ہیں" ـــــ مگر قیامت کے متعلق اس نے اس طرح کی کوئی "رواداری" نہیں دکھائی۔ اس نے ہرگز یہ گوارا نہیں کیا کہ فکر آخرت کے لیے ذہن انسانی میں کوئی واقعی گنجائش باقی رہ جائے۔ اس فرق کی وجہ اس کے سوا اور کوئی نہیں کہ نفس انسانی پر شرائع الٰہیہ کی پابندیاں ہمیشہ گراں گذرتی ہیں، اس

لیے وہ لگاتار اور ہر آن ان سے راہ فرار اختیار کرنے کی سعی کرتا ہے۔ لیکن چونکہ دین اور خدا کا تصور انسانی سرشت میں سمویا ہوا ہے اس لیے اس سے عموماً یہ تو نہ ہو سکا کہ اللہ کے وجود اور اس کی عظمت ہی سے انکار کر دے، مگر قیامت کے تصور کی جڑیں فطرتِ انسانی میں اتنی گہری اور مضبوط نہ تھیں کہ کسی طرح بھی اکھاڑا نہ جا سکے۔ اس لیے اس نے اپنے اس کربِ نفس کا علاج انکارِ قیامت کے ٹوٹکے سے تجویز کیا جسے خدا اور دین و شریعت کا فطری احساس لازماً پیدا کر دیا کرتا ہے۔ مگر یاد رہے یہ انکار بھی یکبارگی نہیں پیدا ہو جاتا، نہ ہی ہو سکتا ہے، بلکہ یہ ہمیشہ تدریجی مراحل سے گذرتا ہے۔ پہلے تو نفس اس مصالحت کا خوش نما دامِ فریب بچھاتا ہے جس کی عملی تصویر اوپر کھینچی جا چکی ہے، پھر اس کے حلقوں کو مضبوط سے مضبوط تر بنانے کی پیہم کوشش میں منہمک ہو جاتا ہے۔ اس کوشش میں وہ کسی درمیانی منزل پر بمشکل ہی ٹھہرتا ہے، اور خواہ اس میں صدیاں لگ جائیں، لیکن اطمینان کا سانس اسی وقت لیتا ہے جب اس رکاوٹ کو اپنے راستے سے بالکل ہٹا چکتا ہے، یا اگر کچھ رعایت کرتا بھی ہے تو بس اسی حد تک جس حد تک کہ کوئی سیکولر اسٹیٹ "دین اسلام" کو اپنے وجود کے اظہار کی رعایت دے دیا کرتا ہے۔ لیکن جس ایمان بالآخرت کا رشتہ انسانی زندگی کے رویہ سے یکسر کٹا ہوا ہو اس کو "ایمان" کہنے کے لیے بڑے ہی بھولے پن کی ضرورت ہے۔

نفسِ امارہ اپنی اس سنت کا اعادہ اُمتِ محمدیہ کے اندر بھی بعینہٖ اسی

طریقہ سے کر رہا ہے جس طرح پچھلی امتوں میں کرتا رہا ہے۔ خدا کے وجود سے انکار تو خال خال ہی نظر آتا ہے اور توحید کے اقرار سے بھی قلوب ایک حد تک معمور ہیں، مگر ایک روزِ جزا کے اندیشے اور آخرت کی باز پرس کے خوف سے دلوں کی بستیاں اس طرح اجڑ گئی ہیں جس طرح کسی زبردست بھونچال کے بعد انسانی آبادیاں اجڑ جایا کرتی ہیں، یہ صحیح ہے کہ زبان سے قیامت کا انکار کرنے والے مسلمان آپ کو شاید ہی ملیں گے، مگر اس عدمِ انکار کے پیچھے خوفِ آخرت کے کتنے عملی شواہد نظر آتے ہیں جن کی بنا پر آپ اس "اقرار" پر اظہارِ اطمینان کر سکیں؟ اگر کونوا هُوْدًا اَوْ نَصَارٰی تَهْتَدُوْا کی قسم کے پندارِ باطل نے چشمِ بصیرت پر تعصب کی پٹی نہیں باندھی ہے تو آپ کو اعتراف کرنا چاہیے کہ آج ہم ایمان بالآخرت کا دعویٰ رکھنے کے باوجود بہت ساری حرکتیں ایسی ہی کر رہے ہیں جیسی ایک خوفِ جزا و سزا سے بے پروا انسان کیا کرتا ہے۔ ایک دیدۂ بینا دنیا پرستی، مصلحت کوشی، افادیت پسندی، اور حدودِ شریعت سے گریز پائی کے اس خوفناک سیلاب کا کیسے انکار کر سکتی ہے جو دلوں پر چھاتا چلا جا رہا ہے اور جس کے اندر ایمان بالآخرت ایک تنکے کی طرح بہتا نظر آ رہا ہے؟

تعمیری تدابیر

ان تنقیحات کے بعد آئیے اب اس مسئلہ کے مثبت اور تعمیری پہلوؤں پر غور کریں، اور کتاب و سنت کی روشنی میں وہ تدابیر معلوم کریں جنہیں اختیار کرنے ہی پر عقیدۂ آخرت کی اجڑی بستی،

دوبارہ آباد ہو سکتی ہے۔

(۱) فکری تطہیر اس سلسلہ کی سب سے پہلی کڑی اپنے ذہن و دماغ کی فکری تطہیر ہے۔ سب سے پہلے اپنے قلب و دماغ کے مکمل جائزہ کی طرف توجہ کرنی چاہیے، اور جس طرح کسی حکومت کی پولیس دشمن کے جاسوس کی جامہ تلاشی لیتی ہے اور اس کے ایک ایک تار کو ادھیڑ کر دیکھتی ہے کہ کہیں کسی گوشے میں حکومت کے خلاف کوئی راز تو موجود نہیں ہے، بعینہٖ اسی طرح پوری دیدہ ریزی اور انتہائی ہوشیاری کے ساتھ اپنے قلب و دماغ کے عمیق ترین گوشوں تک پہنچنا چاہیے، اور پہنچ کر دیکھنا چاہیے کہ اس مملکتِ ایمان میں کہیں نفس اور شیطان کے جاسوس چھپے ہوئے اپنی کارستانیاں تو نہیں کر رہے ہیں؟ یعنی معاملاتِ زندگی کے اندر اپنے عمل و اقدام کا رُخ معین کرنے میں، اور خیر و شر کے دوراہے پر کسی ایک راہ کا انتخاب کرنے میں دل فکر و خوفِ آخرت سے خالی تو نہیں رہتا، "سَيُغْفَرُ لَنَا" اور "لَن تَمَسَّنَا النَّارُ" کی جھوٹی امیدیں کہیں دُنیا پرستی پر تو نہیں اُکساتیں؟ نفس نے دنیا اور آخرت کے درمیان کچھ اس طرح کی مصالحت تو نہیں کر رکھی ہے جس طرح کی مصالحتیں اس سے پچھلی قوموں سے لیے بارہا کرائی ہیں؟

اور اگر خوش قسمتی سے پیروئ اسلام، اعلاء کلمۃ اللہ اور اقامتِ دین کے عزائم کی توفیق مل چکی ہے تو غور کر کے اندازہ لگانا چاہیے کہ کہیں ان عزائم کی تہ میں مسلم

قومیت کا جذبہ تو نہیں کام کر رہا ہے؟ کوئی شوقِ انجمن سازی، کوئی آرزوئے ناموری، کوئی ہوسِ روشناسی، کوئی فریبِ اقتدار طلبی ان نعروں کا محرک تو نہیں؟ اسی طرح کہیں اس مقدس فرض کو محض اس بنیاد پر تو بجالانے کا عزم نہیں ہوا ہے کہ موجودہ عالمگیر معاشی کشاکش اور عمرانی اضطراب اور سیاسی اختلال کے ہنگاموں میں اسلام کا نظام سیاست و معیشت ہی ان ساری گتھیوں کا ایک موزوں حل نظر آرہا ہے؟ اس طرح کے تمام محرکات سے اپنے دل کو پاک کر لینا چاہیے۔ کیونکہ ان محرکات کی ظاہری صورت کتنی ہی معصوم کیوں نہ ہو، مگر فی الواقع ان کا رشتہ بھی گہرائی میں پہنچ کر اسی اصل و مرکز سے جا ملتا ہے جس کو دنیا پرستی کہا جاتا ہے۔ اور ہم یہ پہلے بتا چکے ہیں کہ دنیا پرستی یعنی دنیوی اغراض و مفاد کی بندگی اور ایمان میں واضح تضاد ہے، اور یہ بھی معلوم ہو چکا ہے کہ اقامتِ حق کی راہ دشوار پر اس وقت تک ایک قدم بھی نہیں بڑھایا جا سکتا جب تک کہ دل دنیا پرستی کے ان مختلف اشکال و مظاہر سے پاک اور اللہ کی رضا اور آخرت کی حقیقی جواب دہی کے اندیشوں سے معمور نہ ہو۔ ورنہ ان تمام اغراض سفلی کو، یا ان میں سے کسی ایک غرض کو بھی دل میں چھپا کر طاعتِ حق و اقامتِ دین کی مہم سر کرنے کا خیال باندھنا حماقت ہے یا خود فریبی۔ اس میں صرف اپنی قوتیں ہی ضائع نہیں ہوتیں بلکہ خدا کا دین بھی تماشہ اور باطل کا آلۂ کار بنتا ہے، جو خدا کو اس سے کم مبغوض نہیں جتنا اس فرض کا علانیہ ترک مبغوض ہے۔ اس لیے ضرورت ہے کہ اس فرض کو ادا کرنے کی مہم شروع

کرنے سے پہلے اپنے قلب ونظر کا اچھی طرح جائزہ لے لیا جائے۔ اس ضرورت کی وجہ صرف یہی نہیں ہے کہ اس کے بغیر اللہ تعالیٰ کے حضور ہماری سعی وجہد مقبول نہیں ہوگی، بلکہ یہ بھی ہے کہ اس کے بغیر ہم کو وہ طاقت، وہ عزیمت، وہ صبر، وہ اطمینان، وہ استقلال، وہ بے خوفی، حصول مقصد میں وہ بے قراری، سعی واقدام میں وہ سرفروشی، اور مآل کار سے وہ بے پروائی میسر نہیں ہوسکتی جو اس راہ کا تنہا توشہ اور اس کارزار کا واحد حربہ ہے۔ یہ ایمان باللہ اور ایمان بالآخرت ہی وہ سہارا ہے جو سخت سے سخت حالات میں انسان کی ڈھارس بندھا سکتا اور اس کے قدموں کو اپنی جگہ پر جمائے رکھ سکتا ہے۔ اگر اندر یہ یقین زندہ نہیں، اور اگر آخرت کی بازپرس کا ہلا دینے والا تصور آنکھوں کے سامنے ایک مجسم حقیقت بن کر موجود نہیں تو اس بات کی ہرگز کوئی توقع نہیں کی جاسکتی کہ انسان اس "منزل ہفت خواں" کو طے کر سکے گا۔ یقین جانیے، اگر آج نہیں تو کل وہ الٹے پاؤں پھر جائے گا، اور شکست آرزو کی تلخی سے اس کا منہ بُری طرح بگڑا ہوا ہوگا۔ اس وقت نعرہ اِنِ الْحُکْمُ اِلَّا لِلّٰہِ کی جگہ اس کی زبان پر یہ الفاظ ہوں گے کہ "حق تو یہی ہے، مگر موجودہ حالات میں وہ مفاد ملی کے لیے بھی سخت خطرناک ہے اور اس کی کامیابی بھی ناممکن ہے"! جو اس بات کی علامت ہیں کہ قیامت کی جواب دہی کے احساس پر مردنی چھا رہی ہے، اور اپنے رب کے حضور کھڑے ہونے کی اتنی فکر نہیں جتنی اپنے نفس اور قوم اور ملک اور دنیا کے سامنے کھڑے

ہونے کی ہے۔

جہاں تک ہمارا اندازہ کام کرتا ہے، ایک حساس اور فرض شناس مومن کے لیے آج کل دنیا پرستی کے دوسرے فتنوں اور اس کے اشکال و مظاہر سے دامن کشاں رہنا بہت زیادہ دشوار نہیں، مگر ایک فتنہ ایسا ضرور ہے جس کے پھندوں میں اس کے پاؤں کا اُلجھ جانا ہر آن ممکن ہے، اور واقعات کی گواہی یہ ہے کہ ایسا ممکن ہی نہیں ہے، بلکہ برابر ہوتا رہتا ہے۔ وہ فتنہ ہے دین کی سیاسی محبت اور فلسفیانہ عقیدت کا فتنہ، یعنی دین کی اقامت کو مقصد زندگی بنانے کا اصل محرک فی الواقع احساسِ بندگی اور فکرِ آخرت نہ ہو بلکہ محض اسلام کے سیاسی اور معاشی نظام کی جاذبیت ہو، آخرت کی باز پرس اگر اس اقدام کی محرک ہو بھی تو محض ثانوی حیثیت سے ---- خدا کرے ہمارا یہ اندازہ غلط اور یک قلم خلاف واقعہ ہو، پر قرائن اس کا شبہہ ضرور دلاتے ہیں۔ جس کا سبب یہ ہے کہ اس وقت نظم مملکت اور معاش کے مسائل نے ہمہ گیر اہمیت اختیار کر لی ہے۔ آج کا ہر مفکر کسی نظام کا حسن و قبح معلوم کرنے کے لیے صرف یہ دیکھتا ہے کہ اس نے معاشی مسئلہ کا کیا حل پیش کیا ہے؟ یہ اندازِ فکر اتنا مقبول عام اور یہ معیارِ انتخاب اتنا آفاق گیر ہو چکا ہے کہ اب کہیں سے اس کے خلاف کسی آواز کا اٹھنا تقریباً ناممکن ہے۔ اس عالم میں اس معروف عالم اور پسندیدہ فکری شاہراہ سے ہٹ کر انسانیت اور انسانی زندگی کے مسائل پر سوچنا

دریا کے مخالف رخ تیرنے سے کم دشوار نہیں۔ اور جب صورت حالات یہ ہے تو اس امکان کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا کہ ایک خدا کا نام لیوا بھی نادانستہ اس ڈگر پر جا پڑ سکتا ہے۔ پس جہاں ہمیں اپنے محرک عمل کو اغراض و مصالح دنیوی کی دوسری تمام متعفن غلاظتوں سے پاک کرنے کی بالعموم ضرورت ہے، وہاں اس لطیف نجاست سے قلب و دماغ کی تطہیر خاص توجہ کی مستحق ہے۔ مومن کو شہادت حق کا یہ کام محض اس لیے شروع کرنا چاہیے کہ ہم کو ایک دن اس کی جواب دہی کرنی ہے۔ اور اسی میں ہمارے پروردگار کی خوشنودی ہے، نہ اس لیے کہ اس کے ہو جانے سے دنیا کا معاشی توازن درست ہو جائے گا، یا اس کی طبقاتی نزاع ختم ہو جائے گی، یا اس کے سیاسی اعصاب کا تشنج دور ہو جائے گا۔ یہ باتیں ان سے تو کہی جا سکتی ہیں جو اسلام کے منکر ہیں، تاکہ ان پر اس سراپا حق کی فطری صداقتیں واضح ہو سکیں، اور وہ ایک شاخ کی دلآویزی کو دیکھ کر اس کی اصل کی، اور بحیثیت مجموعی اس پورے شجرۂ طیبہ کی برکتوں کا اندازہ لگا سکیں، مگر ان کو، جو شرح صدر کی نعمتوں سے نوازے جا چکے ہیں اور جو اللہ اور یوم آخرت پر یقین رکھتے ہیں، اس پستی اور پست نگاہی سے بہت بلند ہونا چاہیے۔ ان کو تو تن من دھن سے اللہ تعالیٰ کے احکام کی پیروی اور اس کے دین کی اقامت میں منہمک رہنا چاہیے۔ اور اگر کوئی دانش فروش اس جانفشانی پر انہیں ملامت کرے تو ان کی زبان قال سے نہیں بلکہ زبان حال

سے اس کو یہ جواب ملنا چاہیے کہ۔ اِنَّا نَخَافُ مِنْ رَّبِّنَا یَوْمًا عَبُوْسًا قَمْطَرِیْرًا

(۲) عملی تطہیر ایمان بالآخرت کی اس فکری تطہیر کے بعد دوسرا قدم اس کے عملی جائزہ کی طرف اٹھانا چاہیے، جس کا مفصل ذکر ایمان باللہ کے سلسلہ میں ہم کر چکے ہیں۔ یعنی یہ دیکھنا چاہیے کہ ہمارے اس ایمان میں کتنی طاقت، کیسی کچھ عملی تاثیر، اور کتنی زندگی ہے؟ وہ روزمرہ کے معاملات میں ہم کو خدا پرستانہ طرزِ عمل اختیار کرنے پر کتنا ابھارتا ہے؟ وہ ہمارے طرزِ بندگی میں شانِ حنیفیت پیدا کرنے کا کس قدر بل بوتا رکھتا ہے؟ ہم اس کے تقاضوں کو کس حد تک پورا کر رہے ہیں؟ اگر اس عملی جائزہ سے آپ کو یہ حقیقت محسوس ہو کہ، کم تر یا بیشتر، ہمارے فکر و عمل کی باگ ڈورِ خوفِ آخرت کے ہاتھوں سے چھوٹ جایا کرتی ہے تو خود ساختہ تاویلوں اور حیلہ جوئیوں کی روشِ عام سے بچ کر ایک سیدھے سادے مسلمان کی طرح اپنی کوتاہیوں اور غفلتوں کا دل میں اعتراف کر لینا چاہیے، اور یقین کر لینا چاہیے کہ جس خوفِ قیامت کے ذکر و بیان سے ہماری زبان کو اتنا تعلق ہے، اس کے تذکر اور تیقن سے ہمارے قلب کو اتنا تعلق نہیں ہے، اور ہمارے اندر جو ایمان ہے اس کی روح فی الواقع ابھی تک غفلت اور پژمردگی کی حالت میں مبتلا ہے۔ اس احساس و اعتراف کے بعد دوسرا فرض یہ ہے کہ اس صورتِ حال کا علاج کیا جائے اور اپنی ساری طاقتوں کو مجتمع کر کے، پورے زور کے

ساتھ اس ذریعہ غفلت کے آہنی پنجوں سے اس مقدس روح کو آزاد کرایا جائے۔

یہ کیسے ہوگا؟ اس کے لیے آپ کو کم و بیش وہی تدابیر کرنی پڑیں گی جن کا ذکر ہم ایمان باللہ کے سلسلے میں کر چکے ہیں یعنی:-

(۱) تحصیل یقین! سب سے پہلے تو ہمیں چاہیے کہ اس باب میں نری تقلیدی روش اختیار کرنے سے اپنے کو بچائیں، اور اس ایمان کو محض باپ دادا کی ایک موروثی امانت سمجھ کر گلے لگائے رکھنے پر اطمینان کا سانس نہ لیں۔ کیونکہ کسی خیال یا نظریہ کو صرف اس بنا پر ماننا کہ ہمارے اسلاف واکابر اس کو تسلیم کرتے آئے ہیں، اس نظریہ کے پیروؤں اور علم برداروں کی صف میں شمولیت کا دعویٰ ثابت کرنے کے لیے تو کافی ہو سکتا ہے۔ مگر کسی سینہ میں وہ آگ لگانے کے لیے قطعاً ناکافی بلکہ ناکارہ ہے جس کا وہ نظریہ مطالبہ کرتا ہے۔ کسی فکر کی نری تقلید میدان جدوجہد کے غازی اور جانباز سپاہی ہرگز نہیں پیدا کر سکتی۔ وہ اگر کچھ کر سکتی ہے تو زیادہ سے زیادہ یہ کہ اس معرکہ کے لیے خیمہ بردار قلی مہیا کر دے۔ سینے میں آگ تو صرف وہ نظریہ بھڑکا سکتا ہے جو اتباع آبا کے پردے سے نکل کر انسان کی لوح قلب و دماغ پر براہِ راست اپنی صداقت کی آتشیں شعاعیں ڈال رہا ہو، اور میدان سعی و جہد کے جانفروش مجاہد صرف وہ فکر مہیا کر سکتی ہے جو تقلید کے زنگ خوردہ ذخیرے سے مستعار نہ لی گئی ہو بلکہ انسان کے اپنے شعور میں گہری جڑیں

رکھتی ہو۔ انسان کے بس میں یہ نہیں ہے کہ جس چیز کو اس نے خود نہ دیکھا ہو اس کو محض سن کر اس چیز کے برابر کرے جسے وہ خود اپنی آنکھوں سے دیکھ چکا ہو۔ سنانے والے کا بیان خواہ کتنا ہی گداز قلب کیوں نہ رکھتا ہو، بہرحال دوسرے کی روایت سے آدمی کبھی اتنا پائیدار اثر نہیں لے سکتا جتنا ذاتی مشاہدے کی صورت میں لیا کرتا ہے۔ بڑے سے بڑے قادر الکلام شاعر کی زبان سے بھی سوزِ عشق اور دردِ فراق کے مضامین سن کر آدمی کے دل میں وہ تڑپ پیدا نہیں ہوتی جو خود عشق کی آگ میں جلنے اور ہجر کے انگاروں پر لوٹنے سے پیدا ہوا کرتی ہے۔ پس جب تک آدمی کا ایمان محض اس بنیاد پر قائم رہے گا کہ اس کے باپ دادا ان چیزوں کو مانتے تھے، اس میں نہ تو صحیح کیفیاتِ ایمانی پائی جا سکیں گی اور نہ وہ ایمان کے کامل تقاضے ہی پورے کر سکے گا۔ اس غرض کے لیے ناگزیر ہے کہ ایمان محض تقلیدی نہ ہو بلکہ ذاتی یقین و اذعان پر مبنی ہو۔

اس یقین و اذعان کا سرچشمہ کہاں ہے؟ اسے کہاں سے حاصل کیا جائے اور کس طرح؟ یہ ایک سوال ہے جو اس موقع پر خود بخود ذہنوں سے اُبھرتا ہے۔ یاد ہوگا کہ یہی سوال ایمان باللہ کے سلسلے میں بھی پیدا ہوا تھا۔ پس جو جواب اس کا اس موقع پر دیا جا چکا ہے، وہی یہاں بھی کفایت کرے گا۔ قرآن ہی آپ کا اصل رہنما اور مرجعِ کل ہے، اس سے رجوع کیجیے۔ وہ بتائے گا کہ جس طرح ایمان باللہ کی استواری اس کے بتائے ہوئے طریقِ تفکر پر، اس کے دیے

ہوئے دلائل پر، اور اللہ کے ذکر پر موقوف ہے۔ اسی طرح ایمان بالآخرت کی مضبوطی اور بیداری کا ذریعہ بھی یہی باتیں ہیں۔ اوپر کی بحثوں کو پڑھ لینے کے بعد اب یہ غلط فہمی تو باقی نہ رہی ہو گی کہ قرآن نے توحید اور معاد وغیرہ مبادی دین پر دلائل کا جو انبار لگایا ہے ان کا تعلق صرف منکرین ہی سے ہے اور وہ محض ان ہی پر ان حقائق کو ثابت کرنا اور ان پر حجت تمام کرنی چاہتا ہے، اور جو لوگ ان باتوں کو قبول کر چکے ہیں ان کی ضرورت کے دائرے سے یہ سارے مباحث اور استدلالات باہر ہیں"۔ چنانچہ ایمان باللہ کی بحث میں اس بات کی دلائل کے ساتھ وضاحت کی جا چکی ہے کہ قرآن مومنوں کو بھی ان استدلالات کا حاجت مند ٹھیراتا ہے۔ ٹھیک یہی حال ایمان بالآخرت کا بھی ہے۔ قرآن کہتا ہے کہ اہل ایمان آثارِ کائنات پر مسلسل غور وفکر کی نظر ڈالتے رہتے ہیں۔ اور نتیجہ کے طور پر قیامت کے ہونے والے زلزلے کی خوفناک آوازیں پہلے کے مقابلہ میں اور زیادہ بلند اور قریب سے سننے لگتے ہیں۔ اہل ایمان کے فکر وعمل کی فطری مشغولیتوں پر اس نے جو تبصرے کیے ہیں ان میں سے ایک واضح تبصرے کے الفاظ پھر سنیئے :-

اِنَّ فِیْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ	بلا شبہ آسمانوں اور زمین کی ساخت میں، اور
وَالْاَرْضِ وَاخْتِلَافِ الَّیْلِ وَ	شب وروز کی آمد وشد میں (توحید باری اور یوم
النَّهَارِ لَاٰیٰتٍ لِّاُولِی الْاَلْبَابِ	جزا کے وقوع پر) ان ارباب عقل کے لیے کھلی

اَلَّذِیْنَ یَذْکُرُوْنَ اللّٰہَ قِیَامًا وَّقُعُوْدًا وَّعَلٰی جُنُوْبِہِمْ وَیَتَفَکَّرُوْنَ فِیْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ ھٰذَا بَاطِلًا سُبْحٰنَکَ فَقِنَا عَذَابَ النَّارِ. (آل عمران — ۱۹)	ہر نی نشانیاں موجود ہیں جو کھڑے، بیٹھے اور لیٹے ہر حال میں اللہ کو یاد کرتے اور یاد رکھتے ہیں، اور آسمانوں اور زمین کی ساخت میں غور کرتے رہتے ہیں (جس کے نتیجہ میں ان کی زبان پکار اٹھتی ہے کہ) خدایا! اس (کارخانے) کو تو نے عبث نہیں بنایا ہے، تو بلند اور برتر ہے، پس ہمیں جہنم کی آگ سے بچائیو!

کیا اس ارشادِ خداوندی کے باوجود یہ خیال کوئی صحیح خیال ہوگا کہ مومن کی ساری متاعِ ایمان، بالخصوص ایمان بالآخرت کی متاع، صرف سماع پر منحصر ہے اور کارگاہِ فطرت کے اس کھلے ہوئے صحیفے پر جو دلائل منقوش ہیں ان سے وہ بالکل ہی بے نیاز ہے؟ ہم یہ نہیں کہتے کہ آج ایسا نہیں ہو رہا ہے۔ بلکہ کہنا یہ چاہتے ہیں کہ کیا ایسا ہونا ٹھیک ہے؟ پھر کلام اس بات میں بھی نہیں ہے کہ ایسا کرنے والے ایسا کرنے پر بھی مومن اور مسلم ہیں، کلام تو اس امر میں ہے کہ کیا ایسا کرنے پر بھی ہماری تصویر اس تصویرِ ایمان کا صحیح عکس ہو سکتی ہے جو قرآن نے کھینچی ہے؟ یقیناً اس سوال کا جواب اثبات میں نہیں دیا جا سکتا، اس لیے کہ قرآن نے تو اربابِ دانش اور معیاری اہلِ ایمان کا ایک امتیازی وصف یہ بھی بتایا ہے کہ وہ برابر خلقتِ کائنات میں تفکر کرتے رہتے ہیں۔ اور اس کے

پردوں میں چھپی ہوئی حقیقتوں کا —— توحید باری اور قیام جزا کا —— سراغ پاتے رہتے اور مشاہدہ کرتے رہتے ہیں، اور اس "مشاہدہ غیب میں" ان کی نگاہ کی بینائی اور جلوہ یابی برابر بڑھتی رہتی ہے جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ قیامت اور پرسشِ اعمال کا تصور ایک فطری انداز میں آپ سے آپ زندہ تر ہوتا چلا جاتا ہے۔ گویا اس تصور کو اسکی خالص فطری غذا ملتی جاتی ہے۔ وہ ایک تدریجی ترتیب اور توازن کے ساتھ پروان چڑھتا جاتا اور انسان کے شعور پر چھاتا جاتا ہے یہانتک کہ صرف اس کی کبھی کبھار کی صدائے حال ہی نہیں بلکہ ہر وقت کی صدائے حال بن جاتا ہے۔ اور پھر دیوانے پر "بو" کا وہ اثر نہیں ہوتا جو اس پر قرآن کی آیتوں کا ہوتا ہے، خصوصاً ان آیتوں کا جن میں جزائے اعمال کا ذکر ہو۔ اب اگر ہم اس امتیازی وصف سے اپنے آپ کو بے بہرہ رکھتے ہیں تو کوئی وجہ نہیں کہ اپنے کو کم اندیش اور غافل سمجھنے سے انکار کریں، اور اپنی تصویرِ ایمان کو ناقص ماننے میں لیت ولعل سے کام لیں۔ یہ تو اپنے ہاتھوں اپنا نقصان ہوگا۔

یہ غلط فہمی نہ ہو کہ قرآن نے الفاظ مذکورہ بالا میں صرف ایک صورت واقعہ کی خبر دی ہے، کوئی حکم نہیں دیا ہے، کیونکہ اگرچہ جملے کی ظاہری صورت محض ایک خبر اور واقعہ کی سی ہے مگر اس ظاہری لباس کے اندر جو قالب ہے وہ خبر کا نہیں حکم کا ہے یعنی کہنا یہ نہیں ہے کہ مومن ایسا کرتا ہے، بلکہ فی الحقیقت کہنا یہ ہے کہ اسے ایسا کرنا چاہیے۔

اسی طرح سورۂ مرسلات کی ابتدائی آیات کو پڑھیے جہاں ہواؤں کے مختلف حالات کا ذکر ہے، اور ان کے گوناگوں اثرات کو یوم جزا کی آمد پر بطور قسم (شہادت اور دلیل) پیش کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے:۔

فَالْمُلْقِيَاتِ ذِكْرًا ۔ عُذْرًا اَوْ نُذْرًا اِنَّمَا تُوْعَدُوْنَ لَوَاقِعٌ ۔	پھر جو (اپنی تصریف کے ذریعہ، لوگوں کو یاد دہانی کرتی رہتی ہیں تاکہ (غافلوں کے خلاف اللہ کی طرف سے) معذرت (اور حجت)

ہو اور (خدا ترسوں کے لیے) ڈراوے کا کام دے (ہواؤں کے یہ مختلف حالات اور اثرات شاہد ہیں کہ) جس چیز کی تمہیں دھمکی دی جارہی ہے وہ وقوع میں آکر رہے گی۔

سورۂ ہود کے اندر نافرمانی رب کی پاداش میں ہلاک ہو جانے والی چند بستیوں اور قوموں کی سرگذشت سنانے کے بعد ارشاد ہوتا ہے کہ:۔

اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً لِّمَنْ خَافَ عَذَابَ الْاٰخِرَةِ ۔	یقیناً اس (داستان ہلاکت) کے اندر اس شخص کے لیے (جزائے اعمال کی) ایک بڑی زبردست نشانی ہے جو سزائے آخرت کا خوف رکھتا ہو۔

ایسی آیتیں آپ کو ایک دو نہیں، بے شمار ملیں گی جن میں اس حقیقت کو بے نقاب کیا گیا ہے اور بتایا گیا ہے کہ قرآنی دلائل جس طرح منکرین اسلام سے خطاب کرتے ہیں، بلعینہٖ اسی طرح ان کا رُخ پیروانِ اسلام کی طرف بھی

ہوتا ہے، بلکہ جہاں تک عملاً ان سے فائدہ اٹھانے کا تعلق ہے وہ تو گویا ان ہی کے لیے ہیں، ایسی حالت میں اگر اہل ایمان بھی اپنے ادعائے ایمان کے دام خوش رنگ میں گرفتار ہو جائیں اور ان کلماتِ حق کی یقین آفرینیوں سے بے نیاز بن جائیں جو دلائل آخرت پر مشتمل ہیں، تو پھر نہیں معلوم ان کلمات کا اب مصرف کیا رہا؛ اور اب وہ کس سے اپنے کمال افادیت کی داد حاصل کر سکیں گے؟

پس ہر صاحبِ نظر مومن کا فرض ہے کہ ان آیات قرآنیہ پر مسلسل غور و تدبر کرتا رہے جن میں آخرت پر دلائل دیئے گئے ہیں، اور اس روشنی سے اپنی بینائی میں قوت بہم پہنچاتا رہے جو ان آیتوں کے اندر سے نکلتی رہتی ہیں۔ بلاشبہ قیامت کی آمد غیبِ محض کے واقعات میں سے ہے، اور کوئی انسان اس کو ایک مشاہد حقیقت کی حیثیت سے نہیں پا سکتا، مگر قرآن کے اشارات میں ہمیں اس یقین کے سرچشمے ملتے ہیں کہ اس "غیب" کی جھلکیاں ضرور محسوس کی جا سکتی ہیں، کیونکہ جزا و سزا اور یوم آخرت کے چہرے پر جو نقاب ہے وہ اتنی موٹی نہیں ہے کہ فہم و بصیرت کی گڑی ہوئی نگاہیں کچھ نہ پا سکیں۔ یہ نقاب اگر ادراک نظر سے قطعی مانع ہے تو صرف اسی حد تک جس حد تک کہ ایک حاملہ کا گوشت پوست اس کے حمل کے وجود کو عام نگاہوں سے چھپا سکتا ہے

يَسْئَلُوْنَكَ عَنِ السَّاعَةِ　　یہ لوگ تم سے پوچھتے ہیں کہ قیامت کا جہاز کہاں

أَيَّانَ مُرْسَاهَا قُلْ إِنَّمَا عِلْمُهَا عِنْدَ رَبِّي لَا يُجَلِّيهَا لِوَقْتِهَا إِلَّا هُوَ ثَقُلَتْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ لَا تَأْتِيكُمْ إِلَّا بَغْتَةً۔ (اعراف۔ ۲۳)

لنگر انداز ہے؟ کہہ دو اس کا علم تو محض میرے رب کو ہے، اپنے وقت پر اس کو وہی بے نقاب کریگا۔ لیکن اتنا تو ہر صاحبِ نظر دیکھ سکتا ہے کہ آسمانوں اور زمین کے شکم کے اندر وہ ایک بھاری بوجھ کی طرح ہو رہی ہے۔ وہ جب بھی آئے گی بالکل اچانک آئے گی۔

یعنی جس طرح ایک نو مہینے کی حاملہ اپنی ہیئت کذائی میں خود اپنے حمل کا خاموش اعلان کرتی ہے اور اپنے پیٹ کے چھپے ہوئے بچے کو منظرِ عام پر لے آنے کے لیے بس ایک حکم کی منتظر ہوتی ہے، بعینہٖ ایسا ہی حال اس کائنات کے بطن میں قیامت کا بھی ہے، کہ وہ اس کے "شکم" میں ایک "نو ماہہ حمل" کی طرح موجود ہے۔ اس کے بوجھ سے یہ "شکم" پوری طرح گرانبار ہے۔ اور اسے نکال کر سامنے رکھ دینے کے لیے بس ایک حکم کی راہ تک رہا ہے۔ شکمِ کائنات میں اس حمل کی گراں باری اتنی نمایاں ہے کہ جس کی چشمِ خرد میں کچھ بھی بینائی ہو گی وہ اسے محسوس کیے بغیر نہیں رہ سکتا۔

(ب) استحضارِ فکرِ آخرت

تحصیلِ یقین کی ان کوششوں اور تدبیروں کے ساتھ دوسری ضروری جدوجہد یہ ہونی چاہیے کہ آخرت کا یہ علم و یقین انسان کے دماغ کی حدود سے نکل کر اس کی روح کے نہاں

خانوں میں سرایت کر جائے، اور اس کے حافظہ کے اطراف وجوانب پر پوری طرح چھا جائے اس کو خدائے قہار کے سامنے کھڑے ہو کر اپنے اعمال کی جواب دہی کا خیال حتی الامکان کبھی بھولنے نہ پائے۔ وہ کہیں بھی ہو، کسی حال میں ہو، اس بڑے دن کے ہولناک محاسبے سے غافل اور بے فکر نہ ہو۔ آخرت کا یہ کبھی نہ فراموش ہونے والا اندیشہ ہی دراصل نیک روی اور صلاح عمل کی جان ہے، اور اسی بنا پر میزان الٰہی میں اس کا جو وزن ہے وہ وہم وخیال سے بھی ماورا ہے۔

وہ ذرائع اور تدابیر جن کو اختیار کر کے اس سرچشمۂ تقویٰ اور اس کلید بندگی کو حاصل کیا جاسکتا ہے، مجملاً حسب ذیل ہیں:۔

پہلی چیز جو اس سلسلہ میں ہماری بڑی بھاری اعانت کر سکتی ہے۔ اپنی موت کا تصور ہے۔ اس موت کا تصور جس کا مشاہدہ انسان کو روز ہی ہوتا رہتا ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے موت کو، جو قیامت کا مقدمہ اور حیات اخروی کا دیباچہ ہے اور جس کو یاد رکھنا دراصل یوم آخرت کو یاد رکھنا ہے، بار بار اپنی چشم تصور کے سامنے رکھنے کی بڑی تاکید فرمائی ہے۔ مثال کے طور پر چند ارشادات ملاحظہ ہوں۔ حضرت ابو ہریرہ سے روایت ہے:۔

قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اکثروا ذکر	رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اس چیز کو بکثرت یاد کرتے رہو جو دنیوی لذتوں

هَادِمِ اللَّذَّاتِ الْمَوْتِ۔	(کے اشتیاق) کو ڈھا دینے والی ہے۔
(ترمذی۔ نسائی)	یعنی موت کو۔

حضرت ابن مسعودؓ کہتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے اصحابؓ کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا:۔

اِسْتَحْيُوا مِنَ اللّٰهِ حَقَّ الْحَيَاءِ..... مَنِ اسْتَحْيٰى مِنَ اللّٰهِ حَقَّ الْحَيَاءِ .... وَلْيَذْكُرِ الْمَوْتَ وَالْبِلٰى	اللہ تعالیٰ سے حیا کرو جیسا کہ اس سے حیا کرنے کا حق ہے...... جو شخص اللہ تعالیٰ سے حیا کرنے کا حق ادا کرنا چاہے اس کو لازم ہے کہ..... اپنے مرنے اور مر کر سڑ گل جانے کو یاد کرتا رہے۔
(ترمذی۔ احمد)	

بخاری کی مشہور حدیث ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عبداللہ ابن عمرؓ کا شانہ پکڑ کر پورے اہتمام سے انہیں سکھایا:۔

كُنْ فِي الدُّنْيَا كَأَنَّكَ غَرِيبٌ أَوْ عَابِرُ سَبِيلٍ	دنیا میں ایک اجنبی بلکہ ایک راہرو کی طرح رہو۔ (تاکہ اس کی کوئی شے تم کو تمہارے اصلی "وطن" یعنی اس دوسرے عالم سے غافل نہ کر سکے)۔

موت، قیامت، آخرت، اور جزا و سزا کے خیالات کا استحضار اہل ایمان کے لیے اتنا ضروری ہے کہ اس کے لیے شارع نے اپنی کوئی امکانی تدبیر اٹھا

نہیں رکھی، اور اس کی خاطر بعض ایسے افعال کا بھی حکم دیا جو فی نفسہٖ عام کار لوگوں کے لیے باعث فتنہ ہو جانے کے امکانات سے خالی نہ تھے چنانچہ قبروں کی زیارت سے پہلے روکا گیا لیکن کچھ دنوں بعد اس کی اجازت دے دی گئی، بلکہ اس کی ترغیب اور تاکید بھی فرمائی گئی۔ صحیح مسلم میں حضرت بریدہؓ سے روایت ہے کہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:۔

نَهَيْتُكُمْ عَنْ زِيَارَةِ الْقُبُوْرِ فَزُوْرُوْهَا۔ — میں نے تمہیں قبروں کے پاس جانے سے روک دیا تھا، مگر اب تم جایا کرو۔

زیارت قبور کی یہ ممانعت کیوں ہوئی تھی؟ یہ کوئی راز کی بات نہیں چونکہ ابتدا میں لوگ توحید کے جامع اور تفصیلی تصور کو ہضم نہیں کر سکے تھے، اور زمانہ جاہلیت کے مشرکانہ آداب و رسوم سے، جن کے وہ برسوں عادی رہ چکے تھے، ان کے دل و دماغ پوری طرح مانجھ کر قابل اطمینان حد تک مجلّی نہیں کیے جا سکے تھے، اس لیے اندیشہ تھا کہ کہیں اپنے بزرگوں کی قبروں پر جا کر ناواقفیت کی حالت میں اضطراری طور پر کچھ ایسی حرکتیں نہ کر بیٹھیں جو لوازم توحید کے منافی ہوں۔ یہ اندیشہ کوئی معمولی اندیشہ نہ تھا نہ ہی کمزور بنیادوں پر مبنی تھا بلکہ نفسیاتی حیثیت سے کافی اہم اور واقعی تھا جس پر تاریخی تجربات کی مہر تصدیق بھی لگی ہوئی تھی۔ بنی اسرائیل کی تاریخ آنحضرتؐ کے سامنے تھی، جو اپنی مصری زندگی میں قبطیوں کے مشرکانہ عقائد و اعمال سے مانوس

ہو گئے تھے اور اس لیے حضرت موسیٰ کے ہمراہ سفر کرتے وقت جب ان کا گذر ایک ایسی قوم پر سے ہوا جس نے اپنے معبدوں میں بے شمار مورتیوں کو خدائی کے تخت پر بٹھا رکھا تھا، تو اپنے اسی ہادی و سردار سے، جو ان کو اوّل روز سے ایک ان دیکھے خدا کی پرستش کا درس دے رہا تھا، بے تابانہ اور بے باکانہ اس خواہش کا اظہار کر بیٹھے کہ اِجْعَلْ لَّنَا اِلٰهًا كَمَا لَهُمْ اٰلِهَةٌ (جس طرح ان کے بہت سے معبود ہیں ہمارے لیے بھی ایک معبود بنا دیجیے) پس حکمتِ دین کا تقاضا تھا کہ ہادی اعظم صلی اللہ علیہ وسلم اس وقت تک قبروں پر جانے سے بھی عام مسلمانوں کو روک دیں جب تک کہ ان کے اندر توحید کی پوری روح اپنے تمام لوازم و مقتضیات کے ساتھ اتر نہیں گئی۔ پھر جب یہ ہو چکا تو آپ نے اپنی گذشتہ ممانعت کو واپس لیتے ہوئے اس کی اجازت دے دی، بلکہ اس کی تاکید بھی کر دی۔ اس اجازت اور تاکید کی غایت کیا تھی جس کے عظیم تر فوائد کی خاطر اس زیارت قبور کا حکم دیا گیا جو بالفعل نہ سہی، بالقوہ، کسی نہ کسی مرحلہ پر پہنچ کر مشرکانہ وساوس کو ابھارنے کی صلاحیت اپنے اندر بہرحال رکھتی ہی ہے؟ اس کا جواب بھی خود اسی پاک زبان سے سنیے جس نے یہ حکم دیا ہے:۔

عَنْ اِبْنِ مَسْعُوْدٍؓ اَنَّ	حضرت ابن مسعودؓ سے روایت ہے کہ رسول
رَسُوْلَ اللّٰهِ صلی اللّٰه علیه وسلم	اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: میں نے تم

قَالَ نَهَيْتُكُمْ عَنْ زِيَارَةِ الْقُبُوْرِ فَزُوْرُوْهَا فَإِنَّهَا تُزَهِّدُ فِي الدُّنْيَا وَتُذَكِّرُ الْآخِرَةَ ۔ (ابن ماجہ)

لوگوں کو قبروں کی زیارت سے منع کر دیا تھا۔ مگر اب تم ان کی زیارت کیا کرو، کیونکہ قبروں کی زیارت دنیا سے بے رغبتی پیدا کرتی ہے اور آخرت کو یاد دلاتی ہے"۔

مسلم کی ایک حدیث میں زیارت قبور کی یہی غرض ان لفظوں میں بیان ہوئی ہے :۔

..... فَزُوْرُوا الْقُبُوْرَ فَإِنَّهَا تُذَكِّرُ الْمَوْتَ ۔

...... سو قبروں کے پاس جایا کرو، کیونکہ وہ موت کو یاد دلاتی ہیں۔

معلوم ہوا کہ فکر آخرت کو ہر دم تازہ رکھنے کا سب سے بڑا وسیلہ یہ ہے کہ انسان اپنی موت کو کثرت سے یاد کرتا رہے، اور اس طرح اخروی زندگی کے ساتھ اپنے تعلق کو پائیدار کرتا ہوا اس مقام پر پہنچنے کی کوشش کرے جس کی نشاندہی حضرت ابن عمرؓ کی اس زرّیں نصیحت میں موجود ہے۔

اِذَا اَمْسَيْتَ فَلَا تَنْتَظِرِ الصَّبَاحَ وَاِذَا اَصْبَحْتَ فَلَا تَنْتَظِرِ الْمَسَاءَ (بخاری)

جب شام ہو تو صبح کا انتظار نہ کرو اور جب صبح کر لو تو شام کا انتظار نہ کرو۔

پھر موت اور آخرت کی اس یاد کو با اثر بنانے کی خاطر اس شہر خموشاں

کی سیر بھی کرتے رہنا چاہیے جہاں ہمارے ہی جیسے انسانوں کی بستی ہے، مگر جو اب عمل کے میدان سے نکال کر اپنے رب کے حضور بے چارگی کے عالم میں لا کھڑے کیے گیے ہیں۔ یقیناً اس منظر کے اندر ایک نگاہ عبرت پذیر اور دلِ خوف آشنا کے لیے فکر آخرت کا بہت کچھ سامان موجود ہے۔ یہ دوسری بات ہے کہ انسان تریاق کو اپنے حق میں خود زہر بنا لے، اور قبروں کو سامان فکر آخرت بنانے کی بجائے خدائی طاقتوں کا ایک "سب اسٹیشن" بنا کر ان ہی کو پوجنا شروع کر دے۔

دوسری چیز جو اس فکر آخرت میں زندگی اور تازگی پیدا کرنے کا مؤثر ذریعہ بنتی ہے وہ سارے قرآن کی بالعموم اور ان آیات کی بالخصوص حضورِ قلب کے ساتھ تلاوت ہے جن میں قیامت کے پر ہول کوائف اور مناظر بیان کیے گئے ہیں۔ چنانچہ قرآن مومنوں کی صفت یہی بتلاتا ہے کہ:۔

اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِيْنَ	سچے مومن تو صرف وہ لوگ ہیں جو اللہ کا ذکر
اِذَا ذُكِرَ اللّٰهُ وَجِلَتْ قُلُوْبُهُمْ	سنتے ہیں تو ان کے دل کانپ اٹھتے ہیں، اور
وَاِذَا تُلِيَتْ عَلَيْهِمْ اٰيٰتُهٗ	جب ان کو اس کی آیات پڑھ کر سنائی جاتی
زَادَتْهُمْ اِيْمَانًا (الانفال-۱)	ہیں تو ان کا ایمان بڑھ جاتا ہے۔

پھر اس تلاوت کا بھی اعلیٰ و افضل طریقہ مطلوب یہ ہے کہ قرآن کو نماز کے اندر پڑھا جائے، جب کہ انسان اپنی کامل شانِ عبدیت میں ہوتا ہے

اور اللہ تعالیٰ سے اس کو انتہائی قربت حاصل ہوتی ہے، جس کی وجہ سے اس کی آیتوں کا اثر دوآتشہ ہو جاتا ہے۔ مگر اب تو صورت حال یہ ہو چکی ہے کہ نماز کے لیے ان سورتوں کا انتخاب مشکل ہی سے کیا جاتا ہے جو ایک سانس میں ختم نہ ہو سکیں، اور اس پر مزید ستم یہ کہ جو کچھ بھی پڑھا جاتا ہے، اس کے مطلب سے کوئی واسطہ نہیں ہوتا۔ یہی سبب ہے کہ قرآن کی روشن ہدایتیں اور اس کی پہاڑوں تک کو تھرتھرا دینے والی قوتیں ہمارے لیے بے اثر ہو کر رہ گئی ہیں۔ جس پیمانے سے ہم نے ان کو ناپا، کیا وجہ ہے کہ اسی پیمانے سے وہ ہم کو نہ ناپتیں!

ج۔ لذاتِ دنیا سے بے رغبتی

ایمانِ آخرت کی عملی تطہیر کے لیے دونوں اثباتی تدبیروں کے ساتھ ایک منفی تدبیر بھی اختیار کرنی ضروری ہے، اور وہ یہ کہ انسان دنیوی مرغوبات سے بے نیازی کا خوگر بنتا جائے۔ خواہ کام و دہن کی لذتیں ہوں خواہ مال و زر کی آرزوئیں، جاہ و شہرت کی طلب ہو، خواہ اختیار و اقتدار کی ہوس: ذاتی سربلندی کی خواہش ہو، خواہ وطنی اور قومی بالاتری کی امنگ، ہر شے سے اسے اونچا ہو جانا چاہیے۔ دنیا کا کوئی مفاد اپنے اندر اتنی طاقت نہ رکھتا ہو کہ اسے آخرت کے تقاضوں سے غافل بنا دے، یا اس کو مجبور کر کے اسے دنیا پرستی اور فکر آخرت کے درمیان اس طرح کی مصالحت کرانے پر آمادہ کر دے جس کا ذکر اوپر گذر

چکا۔ اس بارے میں اس کی نگاہ اس فقر پر بھی رہنی چاہیے جسے پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے اختیار فرمایا اور سراہا ہے، اور جس پر آپ نے فخر فرمایا ہے۔ مادیت اور مفاد پرستی کے موجودہ طوفان میں انسان کا اپنے آپ کو اس سے محفوظ بچالے جانا بلاشبہ بڑا ہی مشکل کام ہے مگر اس مشکل سے بہرحال زیادہ مشکل نہیں جو آنکھیں بند ہوتے ہی سامنے آن موجود ہوگی۔

ہم اس بحث کو ختم کرتے ہوئے اس ضرورت کی طرف پھر توجہ دلائیں گے کہ اللہ کے دین کی پیروی، اور اقامت کا نام لینے سے پہلے اس فرض کی اولین شرط پوری کرلی جائے۔ رضائے الہی کے سوا دوسرے تمام محرکات سے اپنے دلوں کو پاک کرلینا چاہیے اور اس سعی وجہد میں صرف آخرت کی بازپرس کا احساس ہی سامنے رہے۔ نیز ایمان بالآخرت میں سے تقلیدی جمود نکال کر اس کے اندر ذاتی معرفت اور بصیرت کی بیدار روح پیدا کرنی چاہیے یقیناً وہ بھی مسلمان ہی تھے جو ہوا کے تیز وتند جھکڑ دل کو دیکھ کر سمجھتے تھے کہ بس زلزلہ قیامت آگیا، اور یہ گمان ایک مجسم خوف بن کر ان کے ذہنوں کو اس طرح گھبرا دیتا تھا کہ وہ پناہ ڈھونڈنے کے لیے مسجد نبوی کی طرف دوڑ پڑتے۔ اور ان کے مقابلہ میں ایک ہم بھی مسلمان ہی ہیں جن کے سکون خاطر میں آج کا بڑے سے بڑا قہر خداوندی بھی کوئی ہلکا سا تلاطم نہیں پیدا کرسکتا۔ یہی قرآن ہے جس کی ایک آیت (فَكَيْفَ إِذَا جِئْنَا مِن كُلِّ أُمَّةٍ بِشَهِيدٍ وَّ

جِئْنَا بِكَ عَلٰى هٰؤُلَاءِ شَهِيْدًا) جب قیامت کے مناظر کا ایک پرتو دکھاتی ہے تو وہ آنکھیں، جن کی طرف جہنم کی چشم وہم بھی اٹھنے کا حوصلہ نہیں کرسکتی، ابل پڑتی ہیں اور رات کا بڑا حصہ بس ایک رکعت کے قیام میں ختم ہو جاتا ہے، زبان پُر اضطراب اسی ایک آیت کو برابر دُہراتی چلی جاتی ہے اندیشۂ آخرت کی شدت سے کہ نہ آنکھوں کو اشک باری سے رُکنے دیتی ہے نہ زبان کو آگے بڑھنے کی اجازت دیتی ہے۔ اور آج وہی قرآن ہے جس کی رعد و برق کی دھمکیاں نہ ہماری آنکھوں سے ایک قطرۂ اشک نکلوا سکتی ہیں اور نہ ہی تلاوت کے وقت ہماری زبانوں کی روانی میں کوئی رکاوٹ پیدا کر سکتی ہیں، یاد رہے یہ ایک نادیدہ قلبِ حال ہے، اس کے ساتھ دین حق کی نہ اطاعت ہو سکتی ہے نہ اقامت۔ دین کی اطاعت و اقامت کے لیے ضروری ہے کہ اس قلبِ حال کا بھی قلب، حال کیا جائے۔

باب چہارم

نماز

تیسری چیز نماز ہے، جو تعمیرِ دین کے باب میں سنگِ اساس کی حیثیت رکھتی ہے، اور جس کے بغیر حقیقتِ دین کا تصور بس اتنا ہی قابلِ قبول ہے جتنا کہ سورج کے بغیر دن کا تصور۔ اعمالِ صالحہ کی پوری فہرست میں سے حقیقتاً یہی ایک عمل ہے جس کو تعمیرِ دین میں بنیادی پتھر ہونے کی حیثیت حاصل ہے۔ یہ صحیح ہے کہ اعمال میں سے صبر کا بھی شمار اسی زمرے میں ہے، جیسا کہ اوپر گذرا، مگر ایک تو حقیقتاً صبر کوئی مثبت شے نہیں، دوسرے اس کا وجود بڑی حد تک خود نماز ہی کا مرہونِ منت ہے، جیسا کہ اگلے باب کی تفصیلات سے واضح ہوگا، اس لیے ایسا کہنا دراصل ایک مسلم حقیقت کا اظہار ہوگا کہ عملی پہلو سے نماز کی اقامت اور اس کی ٹھیک ٹھیک ادائگی پورے دین کی تعمیر ہے۔ لیکن جب تک یہ بات بیان اور استدلال کا جامہ نہ پہن لے، عدہ ذہن میں مشکل ہی بار پا سکتی ہے۔ اس لیے ضرورت ہے کہ

پہلے نماز کی حقیقت اور پھر اس کی اہمیت سمجھ لی جائے، اس کے بعد ہی اس دعوی پر غور کیا جا سکتا ہے۔ ورنہ اس کے بغیر اس کو یوں ہی مان لینا صرف ایک رسمی حسن عقیدت ہے یا پھر تحسین ناشناس، جس کا عملی فائدہ کچھ نہیں، اور اس کو رد کر دینا ایک فریب بے بصری ہے، جس کے انجام کی ہولناکیوں کا تصور نہیں کیا جا سکتا۔

نماز کی حقیقت نماز نام ہے اللہ تعالیٰ کے حضور اپنی غلامانہ اور فدویانہ حیثیت کے اظہار و اقرار کا جس اصطلاح قرآنی کا ترجمہ فارسی اور اُردو زبانوں میں "نماز" کیا گیا ہے وہ لفظ "صلوٰۃ" ہے، جس کے لغوی معنی کسی کی طرف رُخ کرنے، بڑھنے اور قریب ہو جانے کے ہیں۔ پس اصطلاح شرع میں صلوٰۃ یا نماز کا مطلب ہوگا اس اللہ کی طرف ہمہ تن متوجہ ہو جانا، جو تنہا معبود اور اکیلا مقصود اور لاشریک محبوب ہے۔

نماز کی یہ اصل حقیقت ہے جو خود لفظ صلوٰۃ ہی سے ظاہر ہوتی ہے، اور اگر آپ فعل صلوٰۃ کی پوری تصویر اپنے سامنے رکھ لیں تو خود محسوس کر لیں گے کہ یہ نام اپنے مسمیٰ کا کیسا صحیح شارح، ترجمان اور قائم مقام ہے۔ نماز میں آپ کیا کرتے ہیں اور کیا پڑھتے ہیں؟

کرتے آپ یہ ہیں کہ پہلے اس خانہ کعبہ کی سمت رُخ کر لیتے ہیں، جو خدا کی اطاعت اور بندگی کا مرکز، اور اس کی رضا جوئی اور قدوسیت کا دنیا میں سب

سے بڑا نشان ہے، جو ابراہیمی توحید کا خاموش معلّم اور اسماعیلی فداکاری کی دعوت مجسم ہے۔ پھر کانوں تک ہاتھ جاتے ہیں، جو اس امر کا اعلان ہے کہ بندہ دنیا و مافیہا سے کٹ کر، دست بردار ہو کر اپنے آقا و مولا کے دربار میں حاضر ہو رہا ہے۔ پھر دونوں ہاتھ سینے پر باندھ کر، نظریں جھکا کر، اعضاء و جوارح پر عجز و نیاز کی خاموشیاں طاری کر کے مؤدب کھڑے ہو جاتے ہیں۔ چند لمحوں بعد سیدھی پیٹھ خم ہو جاتی اور سر جھک جاتا ہے، اور پھر ہاتھ اور گھٹنے، ناک اور پیشانی خاک پر ہوتی ہیں۔ ادب اور نگونساری کی ان ارتقا پذیر کیفیات کا منظر دیکھ کر بس ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کسی صاحبِ جلال کی غیر محدود اور ہوش ربا عظمتوں کا اعتراف، اور کسی صاحبِ جمال کی بے نہایت خوبیوں کا اقرار کرنا ہے، اس لیے دست بستہ، خاموش اور مؤدب کھڑے ہو گئے۔ مگر دل نے کہا کہ یہ عظمتیں اور یہ خوبیاں کچھ اور چاہتی ہیں، تو بندے نے پیٹھ جھکا دی اور سرِ نیاز خم کر دیا۔ اندر سے پھر آواز آئی کہ ابھی حق ادا نہیں ہوا۔ غلام نے اپنے وہ اعضاء جن کا نام ہی عزت و شرف کا ہم معنی ہے، خاکِ عجز پر ڈال دیئے، اور اس کے بس میں اپنے آپ کو جتنا گرانا اور ڈال دینا اور والہانہ شیفتگی کے ساتھ نثار ہو جانا ممکن تھا اپنے کو گرا اور بچھا کر نثار ہو گیا۔ کیونکہ انسانی دماغ اظہارِ تعظیم و محبت کے لیے ان تین ظاہری ہیئتوں کے سوا اور کوئی ہیئت تجویز نہیں کر سکا ہے۔

پڑھتے آپ یہ ہیں کہ "اللہ سب سے بڑا ہے (اللہ اکبر)" میں نے

ہر طرف سے کٹ کر اپنا رُخ اس ذاتِ عالی کی جانب کر لیا جو آسمانوں کا اور زمین کا خالق ہے، اور میں ہر گونہ شرک سے دور ہوں (اِنِّیْ وَجَّھْتُ وَجْھِیَ لِلَّذِیْ فَطَرَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ حَنِیْفًا وَّمَآ اَنَا مِنَ الْمُشْرِکِیْنَ)" "شکر و سپاس کا مستحق وہ اللہ ہے جو ساری کائنات کا پروردگار ہے الخ (اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ الخ" پاک و برتر ہے میرا رب بزرگ (سُبْحَانَ رَبِّیَ الْعَظِیْمُ)" پاک و برتر ہے میرا رب جو سب سے اونچا ہے" (سُبْحَانَ رَبِّیَ الْاَعْلٰی)" ساری سلامیاں، ساری نمازیں اور ساری مالی عبادتیں اللہ ہی کے لیے ہیں الخ" (اَلتَّحِیَّاتُ لِلّٰہِ وَالصَّلَوٰتُ وَالطَّیِّبَاتُ الخ)" یہ اور اسی طرح کی اور بہت سی چیزیں پڑھتے ہیں۔ ذرا غور تو کیجیے یہ کیا باتیں ہیں جو آپ زبان سے ادا کرتے ہیں اور اس حالت ظاہری اور شانِ تذلل کے ساتھ ادا کرتے ہیں جس کا مختصر ذکر ابھی گذرا؟ اگر انسان کا دل بالکل ہی بے حس اور غفلت زدہ نہ ہو اور ان افعال اور کلمات کے تقاضوں کا اسے ہلکا سا بھی شعور ہو تو نماز کے اندر اسے حاصل ہونے والی ارتقا پذیر روحانی رفعتوں اور باطنی پاکیزگیوں کا اندازہ نہیں لگایا جا سکتا اس لیے کہ یہ فعل نماز عمر میں یا سال اور مہینے میں ایک دو بار ادا کیا جانے والا فعل نہیں ہے، بلکہ مسلسل روزانہ پانچ وقت ادا ہونے والی عبادت ہے۔

اس حقیقت پر ایک اور پہلو سے نظر ڈالیے۔ دین کی اصل اور بنیاد خدا

کی یاد ہے۔ یہ بات اتنی مسلم اور آشکارا ہے کہ قرآن کے جاننے والے کے لیے چنداں محتاجِ تعارف نہیں۔ اب نماز کو لیجیے، اور دیکھیے کہ اس کی کیا حیثیت قرار دی گئی ہے، قرآن میں ہے:۔

ذَكَرَ اسْمَ رَبِّهِ فَصَلّٰى ۔ (اعلیٰ) — اس نے اپنے رب کو یاد کیا اور نماز پڑھی۔

اَقِمِ الصَّلٰوةَ لِذِكْرِي (طٰہٰ) — میری یاد کے لیے نماز قائم کرو۔

گویا اللہ کو یاد کرنا ہو تو نماز پڑھنا چاہیے، کہ یہی اس کی یاد کا موزوں ترین طریقہ ہے۔ یہ صحیح ہے کہ کتاب و سنّت میں ذکر کے اور طریقے بھی ملتے ہیں مگر ان کی حیثیت کامل اور مستقل طریق ذکر کی نہیں ہے، بلکہ وہ اسی ایک طریق کامل کے تضمنات ہیں، اور اس کے لیے ہیں تاکہ اس کے معاون اور حصول مقصد کے باب میں اس کے خدمت گذار بنیں۔ اب ان دونوں حقیقتوں کو ایک ساتھ رکھ کر دیکھیے اللہ کی یاد دین کی بنیاد ہے، نماز نام ہے اللہ کی یاد کا، اس سے ایک تیسری حقیقت ہاتھ آئی، اور وہ یہ کہ نماز جہاں تک عمل کا تعلق ہے، دین کی بنیاد ہے۔

نماز کی اہمیت

علمی طور پر نماز کی حقیقت جان لینے کے بعد اس کی عملی اہمیت پر غور کیجیے۔ جو شخص بھی نماز کی ان ظاہری اور باطنی، ساری خصوصیات کو سامنے رکھ کر غور کرے گا اس پر یہ حقیقت روز روشن کی طرح عیاں ہو جائے گی کہ یہی نماز اصل بندگی ہے، یہ گو کہنے میں ایک عمل

اور تنہا فعلِ عبادت ہے، مگر حقیقت کے اعتبار سے سارا دین اس کے اندر سمٹا ہوا ہے، اور وہ پوری شریعت ہے۔ چنانچہ زبانِ رسالت نے گواہی دی ہے کہ نماز ہی دین کا مرکزی ستون ہے، جو اس ستون کو قائم رکھے گا وہ اپنے دین کو قائم رکھے گا، اور جو اسے ڈھا دے گا، وہ پورے دین کو تاراج کر کے رکھ دے گا۔ (والصلوٰۃ عماد الدین من اقامها اقام الدین و من هدمها هدم الدین)

اس سے بھی زیادہ وضاحت اگر مطلوب ہو تو حسبِ ذیل ارشادات نبوی پر نظر ڈالیے:-

(ا) من ترك الصلوٰة متعمداً فقد کفر	جس کسی نے جان بوجھ کر نماز چھوڑ دی اس نے کفر کیا
(ب) بَیْنَ العبدِ وبینَ الکفرِ ترکُ الصّلوٰۃِ۔ (مسلم)	بندے اور کفر کے درمیان کا پردہ نماز ہے

کتنے لرزہ آفرین الفاظ ہیں! بڑی سے بڑی تاویل بھی ان کی قاہریت ختم نہیں کر سکتی۔ وہ جو کچھ کر سکتی ہے وہ صرف اتنا ہی ہو گا کہ ان ارشادات کو "اسلوبِ تغلیظ" پر محمول کر دے، اور قانون و سیاست کی حد تک انسان کو بچالے جائے، مگر آگے کے لیے یقیناً وہ بھی کوئی اطمینان نہیں دلا سکتی۔

تمام احکامِ دین میں سے یہ نماز ہی ہے جس کے ترک کر دینے والوں کے

نہیں، بلکہ جسے باجماعت نہ ادا کرنے والوں کے حق میں اللہ کے رسول نے فرمایا تھا جی کہتا ہے کہ اگر اندر ان کے ساتھ بچے اور عورتیں نہ ہوتیں تو ان کے گھروں کو آگ لگا دیتا" یہ اس رسول کے الفاظ ہیں، جس کی صفت امتیاز یہ ہے کہ وہ رحمۃ للعلمین تھا۔ اس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ نماز کو دین اور احکام دین کے اندر کیا مقام حاصل ہے۔

کلام رسول کو چھوڑ کر کلام اللہ کی طرف آیئے تو اسی حقیقت کے جلوے وہاں بھی نظر آئیں گے، اور اتنی آب و تاب کے ساتھ نظر آئیں گے کہ تردد کی ساری تاریکیاں کافور ہو چکی ہوں گی۔ قرآن میں صرف یہی نہیں ہے کہ حکم نماز کا بار بار، صدہا جگہ اعادہ کیا گیا ہے، بلکہ ایسا بھی ہے کہ اس کے ذکر میں بیان و ادا کے رنگا رنگ اسالیب اختیار کیے گئے ہیں۔ اسالیب کی یہ بوقلمونی نہ صرف نماز کی مطلق اہمیت ہی کا اظہار کرتی ہے، بلکہ اس کے متعدد پہلوؤں پر بار است اشارہ بھی کرتی ہے، اور اس طرح نماز کی اہمیت کا اجمالی تصور تفصیلی یقین اور کامل شرح صدر سے بدل جاتا ہے۔ ہم یہاں چند ایسی آیات درج کرتے ہیں جن میں سے ہر ایک اپنے مخصوص اسلوب بیان کی بنا پر نماز کی اہمیت کے کسی نہ کسی نئے پہلو کو نمایاں کرنے والی ہے۔

(۱) اِنَّمَا يُؤْمِنُ بِاٰيٰتِنَا الَّذِيْنَ اِذَا ذُكِّرُوْا بِهَا — ہماری آیتوں پر صرف وہی ایمان لاتے ہیں جو، اس وقت جب کہ انہیں ان آیتوں کے

خَرُّوْا سُجَّدًا وَّسَبَّحُوْا بِحَمْدِ رَبِّهِمْ وَهُمْ لَا يَسْتَكْبِرُوْنَ تَتَجَافٰى جُنُوْبُهُمْ عَنِ الْمَضَاجِعِ يَدْعُوْنَ رَبَّهُمْ خَوْفًا وَّطَمَعًا (سجدہ ۱۵-۱۶)	ذریعہ یاد دہانی کرائی جاتی ہے، سجدہ میں گر پڑتے ہیں، اور اپنے رب کی حمد کرتے ہوئے اس کی تسبیح کرتے ہیں........ اور (اس سے اپنے کو برتر نہیں ٹھہراتے۔ (رات میں) ان کے پہلو بستروں سے دور ہوتے ہیں اور وہ اپنے رب کو خوف و رجا کے عالم میں پکارتے ہوتے ہیں::

اس آیت سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ ایمان کا پہلا لازمی مظہر نماز ہے۔ اس بات کو آپ اگر یوں کہہ دیں کہ نماز ہی سچے ایمان کا ثبوت ہے تو الفاظ بدل جائیں گے مگر حقیقت نہ بدلے گی۔ اس آیت کی مماثل آیات سے قرآن کے اوراق بھرے پڑے ہیں۔ پہلے ہی ورق پر آپ کو یہ الفاظ ملیں گے۔

الٓمّٓ۔ ذٰلِكَ الْكِتٰبُ لَا رَيْبَ فِيْهِ هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ الَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِالْغَيْبِ وَيُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ الخ (البقرہ)	الف لام میم۔ یہ وہی کتاب (موعود) ہے۔ اس میں کوئی شبہ نہیں، یہ ان لوگوں کے لیے ہدایت بن کر آئی ہے جو متقی ہیں، یعنی جو بن دیکھے ایمان لاتے ہیں اور نماز قائم کرتے ہیں۔ الخ

دوسرے مقامات پر فرمایا گیا ہے:۔

فَلَا صَدَّقَ وَلَا صَلّٰى (القیامہ)	پس نہ تو اس نے (کتاب الٰہی کو) مانا، نہ نماز پڑھی۔

وَالَّذِیْنَ یُمَسِّکُوْنَ بِالْکِتٰبِ وَاَقَامُوا الصَّلٰوۃَ اِنَّا لَا نُضِیْعُ اَجْرَ الْمُصْلِحِیْنَ۔ (اعراف)

اور جن لوگوں نے کتاب الٰہی کو مضبوطی سے تھام لیا اور نماز قائم کی، بلاشبہ ہم (ان) اصلاح کرنے والوں کا اجر ضائع نہیں کریں گے۔

یہ اور اسی طرح کی بے شمار آیتیں ہیں جن میں ایمان کے بعد ہی نماز کا ذکر ہے جو نماز کے اولین ثمرۂ ایمان ہونے کا ثبوت ہے، اور بسا اوقات یہ صرف یہ کہ نماز کا ایمان کے بعد سب سے پہلے ذکر آتا ہے، بلکہ صرف اسی کا نام آتا ہے۔ مثلاً یہ آخری آیت، کہ اس نے تمسک بالکتاب (کتاب الٰہی کو مضبوطی سے تھامے رکھنے) کے ذکر کے بعد دیگر سارے احکام سے صرف نظر کر لیا اور محض نماز ہی کے ذکر پر اکتفا کر لیا ہے۔ یہ ایک اور حقیقت کی طرف اشارہ ہے جس کی شرح و تبیین ابھی آگے چل کر مستقل طور پر آتی ہے۔ یہاں صرف اتنی بات سمجھ لینے اور یاد رکھ لینے کی ہے کہ نماز ایمان کا لازمی تقاضا اور اس کے وجود کا حقیقی مظہر ہے۔ مذکورہ بالا مثبت شواہد کے بعد بھی اگر کوئی حجاب باقی رہ گیا ہو تو سورۂ مدثر کی یہ منفی شہادت بھی سن لیجیے، یقین ہے کہ اس کے بعد یہ حجاب بھی اٹھ جائے گا:۔

مَا سَلَکَکُمْ فِیْ سَقَرَ قَالُوْا لَمْ نَکُ مِنَ الْمُصَلِّیْنَ الخ

(فرشتے اہل دوزخ سے پوچھیں گے، تمہیں دوزخ میں کیا چیز لے آئی؟ جواب دیں گے ہم نماز پڑھنے والوں میں نہ تھے الخ:۔

یہ معلوم ہے کہ یہ کفار کا قول ہے، جن کا وہ جرم جو انہیں دوزخ کا ایندھن بنوائے گا، ان کا کفر ہوگا، اور پھر کفر سے پیدا ہونے والی نافرمانیٔ معبود، لیکن وہ پوچھنے پر جواب یوں نہیں دیتے کہ ہم ایمان نہیں لائے تھے، اس لیے مبتلائے عذاب ہوئے ہیں، بلکہ جواب کی ابتدا یوں کرتے ہیں کہ "ہم نماز پڑھنے والے نہ تھے" اور باقی چیزوں کا اگر ذکر کرتے بھی ہیں تو بعد میں، اس کا مطلب یہ ہوا کہ توحید و معاد پر ایمان، اور نماز کی اقامت، ان دونوں باتوں میں اتنی زبردست پیوستگی ہے کہ بوقت ضرورت بلا تکلف ایک دوسرے کی قائم مقامی کر سکتی ہیں۔ گذشتہ مباحث میں سورۂ بقرہ کی جس آیت (۴۶) کا کئی بار حوالہ دیا جا چکا ہے وہ اس حقیقت کی سب سے زبردست گواہ ہے، اس نے غیر مبہم انداز میں بتا دیا ہے کہ وہ شخص ادائے نماز کا بار گراں نہیں اٹھا سکتا، جس کا قیامت پر یقین نہ ہو۔ گویا اس کا کہنا یہ ہے کہ نماز ہی ایمان بالآخرت کی کسوٹی ہے۔

ایمان اور نماز کا یہی گہرا تعلق ہے جس کی وجہ سے وحی الٰہی ایمان کے بعد ہی سب سے پہلے نماز کا حکم دیتی رہی ہے چنانچہ مضمون کے آغاز میں ہم اس کی بعض مثالیں بھی درج کر چکے ہیں۔

(۲) قَدْ اَفْلَحَ الْمُؤْمِنُوْنَ — فلاح یاب ہوئے وہ ایمان لانے والے جن

الَّذِیْنَ ھُمْ فِیْ صَلٰوتِھِمْ خَاشِعُوْنَ — کی نمازوں میں خشوع ہوتا ہے ......

..... وَالَّذِیْنَ ھُمْ عَلٰی صَلٰوتِھِمْ — ..... اور جو اپنی نمازوں کی پوری نگہداشت

یُحَافِظُوْنَ (مومنون ۱۰ تا ۹) کرتے ہیں۔

بادی النظر میں یہ آیتیں صرف ایک سچے مومن کی امتیازی صفات بتانے والی ہیں، مگر واقعہ کے اعتبار سے یہ ایک عظیم ترین رازِ شریعت کی حامل بھی ہیں۔ اگر بات صرف اتنی ہوتی کہ ایک سچے مومن کے اعمال و کردار کے کچھ نمایاں خط و خال بتا دیے جائیں تو آخر کا جملہ (وَالَّذِیْنَ ھُمْ عَلٰی صَلٰوتِھِمْ یُحَافِظُوْنَ) بالکل بے ضرورت ٹھیرتا ہے، یا پھر خلافِ ترتیب اور بے موقع جب کہ اللہ کا اعجازی کلام ہر عیب سے پاک ہے۔ پھر اگر یہ جملہ موجود ہے تو اس کی خاص وجہ ہونی چاہیے اور یہ معلوم کرنے کی کوشش ہونی چاہیے کہ آخر نمازہی کا ذکر کرر کیوں فرمایا گیا، اور دوسرے اعمال (لغو باتوں اور کاموں سے کنارہ کشی، زکوٰۃ کی ادائگی، عفت، ادائے امانت اور ایفائے عہد)، کا ایک ہی بار ذکر کافی سمجھا گیا؟ کیا اس اسلوب سے دوسرے مکارمِ اخلاق و اعمال کے مقابلہ میں نماز کی کوئی افضلیت اور خصوصیت نہیں ٹپک رہی ہے؟ قرآنی اسالیبِ بیان کا اداشناس تو درکنار ایک عام صاحبِ ذوق اور نکتہ رس ادیب بھی اس سوال کا جواب نفی میں نہیں دے سکتا۔ اس کا مذاقِ سخن فہمی پکار اٹھے گا کہ یقیناً اس اندازِ بیان سے نماز کی خاص اہمیت کا انکشاف مقصود ہے۔ سوال یہ ہے کہ یہ خاص اہمیت کیا ہے؟ اس سوال کا جواب سوچتے وقت ہمیں ان آیتوں کے نظم کو ذرا غور سے دیکھنا چاہیے۔ یہ نظمِ آیات اس

طرح کا ہے کہ پہلے نماز کا ذکر ہے، پھر چند دیگر بنیادی اعمالِ خیر کا بیان ہے۔ آخر میں پھر نماز کا تذکرہ آیا ہے، اور اسی پر اس فقرے (پیراگراف) کو ختم کرتے ہوئے بات مکمل کر دی گئی ہے۔ اس ترتیبِ بیان کا مطلب یہ ہوا کہ نماز کی حیثیت گویا ایک دائرے اور حلقے کی سی ہے، اور دیگر احکامِ شریعت اس کے اندر محفوظ ہیں۔ گویا نماز ہی شریعت کا عملی نقطۂ آغاز بھی ہے اور نقطۂ اختتام بھی۔ پوری شریعت کی بقا، اسی کی بقا پر منحصر ہے، اور یہی ایک اکیلی شے پورے دین کی نگراں ہے۔ قرآن میں یہ حقیقت اتنی بار دہرائی گئی ہے کہ اس کا شمار کرنا مشکل ہے۔ آپ کسی بھی مدنی سورہ کو پڑھنا شروع کیجیے، آپ پائیں گے کہ جہاں کہیں بھی احکام و شرائع کا بیان ہے، ذکر اور نماز کی ہدایت اس کے پہلو میں ضرور موجود ہے۔ کلامِ الٰہی منزلی، معاشرتی، تمدنی اور سیاسی ضابطے بیان کر رہا ہوتا ہے، کہ یکایک کہیں اجمال کے ساتھ اور کہیں تفصیل کے ساتھ، ذکر و نماز اور حمد و تسبیح کی تلقین آجاتی ہے، جس کا کھلا ہوا مطلب یہ ہے کہ ان ضوابط پر عمل اسی وقت ممکن ہے جب اللہ کے ذکر سے تمہارا باطن نغمہ ریز ہو، اور وہ قوتِ انقیاد جو ان احکام و شرائع پر عمل کرنے کے سلسلہ میں درکار ہے، تم اس وقت حاصل کر سکتے ہو جب کہ تمہارے دل میں یادِ الٰہی کا سرچشمہ جاری ہو اگر تمہارا ربابِ باطن خاموش ہو گیا اور اس کے تاروں سے اس نغمۂ لاہوتی کا ترنم بند ہو گیا تو معصیت کا زنگ اسے سیاہ بنا دے گا، اور

اگر تمہارے دل میں یہ سرچشمہ نیز خشک ہوگیا تو پھر اس سے صلاح عمل کا فیضان نہ ہوسکے گا۔ تمہاری زمام عمل خدا پرستی اور اتباع شریعت کے ہاتھوں سے نکل کر نفس اور شیطان کے ہاتھوں میں پہنچ جائے گی۔ یہ بات، جو آیت مذکورہ بالا اور اسی طرح کی دوسری آیات سے اشارۃً مستنبط ہوتی ہے بعض آیتوں میں بالکل صراحت سے مذکور ہے مثلاً

اَضَاعُوا الصَّلٰوۃَ وَاتَّبَعُوا الشَّهَوَاتِ (مریم) — انہوں نے نماز ضائع کر دی اور شہواتِ نفس کے پیرو بن گئے۔

معلوم ہوا کہ پیروی نفس براہِ راست نتیجہ ہے نماز ضائع کر دینے کا، اور اس کی وجہ بالکل عیاں ہے۔ انسان کی حیوانی جبلت ہر آن اسے خواہش نفس کی پیروی پر ابھارتی رہتی ہے، اور شریعت کی پیروی کا دارو مدار ہی اس بات پر ہے کہ نفس کو لگام لگائی جائے۔ اس لیے انسان کے اندر ہر دم ان دونوں تقاضوں میں سخت کشاکش ہوتی رہتی ہے۔ اس کشاکش میں تقاضائے نفس کو ٹھکرا دینے کا بل بوتا صرف وہی شخص رکھ سکتا ہے جسے اللہ اور آخرت پر کامل یقین ہو، یہ یقین اس کے اندر خشوع کی کیفیت پیدا کرتا ہے، اور یہ خشوع ہی ہے جو قیام و رکوع و سجود کے قالب میں ڈھل کر صورت نماز اختیار کرتا ہے۔ وَاِنَّهَا لَكَبِيْرَةٌ اِلَّا عَلَى الْخٰشِعِيْنَ اور قَدْ اَفْلَحَ الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِيْنَ هُمْ فِيْ صَلَاتِهِمْ خٰشِعُوْنَ کے جو الفاظ اوپر گذر چکے ہیں، ان

سے خشوع اور نماز کا یہ ربط بالکل نمایاں ہو چکا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ نماز کی یہ صفت اور تاثیر بیان کی گئی ہے کہ وہ انسان کو فحشاء اور منکر سے بچاتی ہے، اِنَّ الصَّلٰوۃَ تَنْھٰی عَنِ الْفَحْشَآءِ وَالْمُنْکَرِ (عنکبوت)

نماز کا دیگر احکام شرع کی نگراں اور محافظ ہونا قرآن کے نزدیک اتنی زیادہ مسلم اور استوار حقیقت ہے کہ وہ بسا اوقات ایسے مواقع پر صرف نماز کا نام لے کر رہ جاتا ہے جہاں اس کا مدعا پورے مجموعۂ اخلاق و شرائع کے بیان کرنے کا ہوتا ہے۔ گویا اس کی نگاہ میں نماز احکام شریعت کے پورے مجموعے کی قائم مقام ہے۔ نماز جڑ ہے اور دوسرے سارے احکام اسی جڑ سے نکلنے والی شاخیں۔ چنانچہ جب قرآن سچے مومنوں کے اوصاف کا اجمالی تعارف کرانا چاہتا ہے تو بالعموم یہ جملہ استعمال کرتا ہے کہ "وہ لوگ جو ایمان لائے اور جنہوں نے صالح اعمال کیے" (اَلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ) لیکن اس "عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ" کے اجمال کو جب کبھی وہ تفصیل کی روشنی میں لانا چاہتا ہے تو سب سے پہلے نماز کا نام لیتا ہے۔ مثلاً:-

اِنَّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا	یقیناً وہ لوگ جو ایمان لائے، اور جنہوں نے
الصّٰلِحٰتِ وَاَقَامُوا الصَّلٰوۃَ الخ (بقرہ)	صالح اعمال کیے، یعنی نماز قائم کی الخ

یہ اشارہ اسی بات کی طرف ہے جس کا ہم ذکر کرتے آرہے ہیں، یعنی یہ کہ

نماز ہی سرچشمۂ خیر و فلاح ہے، اور دیگر سارے اچھے اعمال اسی سے معرض

وجود میں آتے ہیں۔ اسی لیے کبھی کبھی وہ ایمان کے بعد صرف نماز کا ذکر کر کے رہ جاتا ہے۔ اَلَّذِیْنَ یُمَسِّکُوْنَ بِالْکِتٰبِ وَاَقَامُوا الصَّلٰوۃَ کے الفاظ ابھی نقل کیے جا چکے ہیں، وہاں پورے مجموعۂ شریعت کی پیروی کا مفہوم صرف اقامتِ نماز کے ایک لفظ سے ادا کر دیا گیا ہے۔ اس لیے کہ جب جڑ کا نام لے دیا گیا تو ضروری نہیں کہ اس سے نکلنے والی ایک ایک شاخ کا شمار کیا جائے۔

(۳) قَالَ مُوْسٰی لِقَوْمِہِ اسْتَعِیْنُوْا بِاللّٰہِ وَاصْبِرُوْا (اعراف ۱۲۸) — موسیٰ نے اپنی قوم سے کہا، مدد لو اللہ سے" اور صبر کرو۔

اس آیت کو آیت ذیل کے ساتھ پڑھیے:۔

وَاسْتَعِیْنُوْا بِالصَّبْرِ وَالصَّلٰوۃِ (بقرہ) — اور (اے بنی اسرائیل!) صبر اور نماز سے مدد لو۔

صاف معلوم ہو گا کہ ایک ہی بات ہے جو دونوں آیتوں میں کہی گئی ہے، مگر الفاظ کا فرق ہے، اور فرق یہ ہے کہ پہلی آیت میں جس جگہ "اللہ" کا لفظ ہے، اس جگہ دوسری آیت میں "صلوٰۃ" کا لفظ ہے۔ جو لوگ اس حقیقت سے ناواقف نہیں ہیں کہ قرآن محض الفاظ اور اسالیب کے ہلکے سے تغیر کے ذریعہ بڑے بڑے اہم نکاتِ حکمت بیان کر جاتا ہے وہ اس اختلاف الفاظ کو بلا وجہ نہیں قرار دے سکتے۔ وہ محسوس کریں گے

کہ اس اختلاف کے اندر کوئی نہ کوئی حکمتِ دین ضرور مخفی ہے، اور یہ حکمت دین اس کے سوا اور کچھ نہیں ہو سکتی کہ نماز اللہ کی قربت بلکہ معیت کا نام ہے، جبھی ایسا ہوا کہ لفظ "صلوٰۃ" لفظ "اللہ" کا، یا لفظ اللہ لفظ "صلوٰۃ" کا قائم مقام بن گیا، اور اختلاف الفاظ کے باوجود بات ایک ہی رہی۔

یہ بات کہ نماز اللہ تعالےٰ کے قرب کا نام ہے، بہت کھلی ہوئی ہے۔ خود لفظ "صلوٰۃ" کا لغوی مفہوم اس کا شاہد ہے، پھر آیات و احادیث میں اس کی کتنی ہی وضاحتیں موجود ہیں۔ سورۂ علق کے آخری الفاظ اس باب میں بالکل حرفِ آخر کی حیثیت رکھتے ہیں:۔

وَاسْجُدْ وَاقْتَرِبْ — (اپنے رب کی) سجدہ کر اور اس کے قریب ہو جا

پھر کسی ہستی کا قرب اس کی معیت کا پیش خیمہ ہے، بلکہ یوں کہنا زیادہ صحیح ہو گا کہ قرب جب اپنے نقطۂ عروج پر جا پہنچتا ہے تو معیت کی شکل اختیار کرتا ہے۔ یہی سبب ہے کہ نماز کے متعلق حدیث میں یہ الفاظ آئے ہیں۔

فَاِنَّ الْعَبْدَ یُنَاجِیْ رَبَّہٗ — نماز کے اندر بندہ اپنے رب سے سرگوشی کرتا ہے

اور پھر یہ کہ:۔

مَا یَزَالُ الْعَبْدُ یَتَقَرَّبُ اِلَیَّ بِالنَّوَافِلِ حَتّٰی اُحِبَّہٗ — بندہ ادائے نوافل کے ذریعہ برابر میرے قریب ہوتا جاتا ہے، یہاں تک کہ میں

فَاِذَا اَحْبَبْتُہٗ کُنْتُ سَمْعَہٗ الَّذِیْ بِہٖ یَسْمَعُ وَبَصَرَہٗ الَّذِیْ بِہٖ یُبْصِرُ وَیَدَہٗ الَّتِیْ بِھَا یَبْطِشُ	اسے اپنا محبوب قرار دے لیتا ہوں، اور جب ایسا ہو جاتا ہے تو میں ہی اس کے کان بن جاتا ہوں جس سے وہ سنتا ہے، اس کی آنکھیں بن جاتا ہوں جس سے وہ دیکھتا ہے، اس کے ہاتھ بن جاتا ہوں جن سے وہ پکڑتا ہے۔

یہ الفاظ کسی بھی تفصیل اور تاویل سے بے نیاز ہیں، اور نماز کے مقام کی تعیین میں بالکل واضح۔ ہاں یہ صحیح ہے کہ دوسری حدیث میں نماز کا لفظ نہیں ہے، بلکہ "نوافل" کا لفظ ہے۔ اور نوافل جس طرح نماز کے ہوتے ہیں اسی طرح دوسری عبادات میں بھی ہوتے ہیں۔ مگر اس حقیقت کے تسلیم شدہ ہونے کے باوجود اس امر میں شاید دو رائیں نہیں ہو سکتیں کہ "نوافل" کا اطلاق اول نوافلِ نماز ہی پر ہوتا ہے، دوسری عبادات کے نوافل پر اس کا اطلاق اگر ہوتا ہے تو ثانوی درجہ ہی میں ہوتا ہے۔

(۴) یٰۤاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اسْتَعِیْنُوْا بِالصَّبْرِ وَالصَّلٰوۃِ الخ	اے ایمان لانے والو! راہِ حق میں پیش آنے والی مشکلات کے مقابلہ میں صبر اور نماز سے مدد لو۔

یہ آیت اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ ان مصائب و آلام کا مقابلہ

جن سے خدا پرستی اور طاعت و اشاعتِ حق کے دلدادوں کا دوچار ہونا سنت

الٰہی کے مطابق بہر حال ضروری ہے، صرف صبر اور نماز سے کیا جا سکتا ہے۔ صبر کے متعلق پہلے ہم اجمالاً یہ عرض کر چکے ہیں، اور آگے اس اجمال کی تفصیل بھی آئے گی کہ وہ کوئی مستقل بالذات شے نہیں، بلکہ دراصل وہ نماز ہی کا فیضان ہے، اس لیے عملاً استقامت علی الحق کا دارومدار صرف نماز پر آن ٹھیرتا ہے۔ قرآن کے اوراق اس مفہوم کی آیتوں سے بھرے پڑے ہیں، اور راہ حق میں پیش آنے والی ہمت شکن مشکلات کا مقابلہ کرنے کے لیے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو اور آپ کے پیرووں کو حمد و تسبیح اور ذکر و نماز کی تلقین انتہائی صراحت کے ساتھ موجود ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس ہدایت پر کس طرح عمل کیا۔ اس کا اندازہ اس مشہور روایت سے لگایا جا سکتا ہے کہ "جب آپ کو کوئی بات غمگین اور متفکر کرتی تو آپ نماز پڑھنے کھڑے ہو جاتے (اذا حَزَبَهٗ اَمرٌ صلّی)" گویا یہ نماز وہ داروئے شفا ہے جو نہ صرف دعوت و تبلیغ کی راہ میں پیش آنے والے افکار کو نابود کر دیتی ہے، بلکہ دل کی ہر پریشانی کو سکون میں بدل دیا کرتی ہے۔

یہ طاقت نماز میں کہاں سے اور کیوں کر آتی ہے؟ اگر اوپر کی گذارشیں ذہن میں محفوظ ہوں تو اس سوال کا جواب چنداں دشوار نہیں۔ جب نماز اللہ کی معیت کا نام ہے تو غور کیجیے، جس کے ساتھ اللہ ہو اسے زیر کرنے کی راہ افکار و مصائب کیسے پا سکتے ہیں؟ کبھی آپ نے برف خانے میں جانے کے

بعد گرمی کی شدت محسوس کی ہے؟ اگر نہیں، تو نماز یعنی خنکیوں کے سرچشمہ پر سوزشِ آلام کا کیا گذر۔ اللہ کی معیت کے تو معنی ہی یہ ہیں کہ دل سکون وطمانیت کی دولت سے مالا مال ہو، اور خوف وحزن کا دور دور تک نام ونشان نہ ہو۔ غارِ ثور کے اندر حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے طبعی اضطراب کو دیکھ کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جب یہ فرمایا تھا کہ "لَا تَحْزَنْ" (غمگین نہ ہو) تو اس کے ساتھ ہی اس کی وجہ بھی ظاہر کر دی تھی کہ "اِنَّ اللّٰہَ مَعَنَا" (اللہ ہمارے ساتھ ہے) اسی طرح خود نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو جب یہ حکم ہوا کہ مخالفتوں کے طوفان میں بھی اپنی جگہ سے بال برابر نہ ہٹیں اور مضبوطی سے اپنے مقام پر جمے رہیں تو جہاں یہ الفاظ فرمائے گئے کہ وَاصْبِرْ لِحُکْمِ رَبِّکَ (اپنے رب کے حکم پر ثابت قدم رہو) وہیں یہ صدائے جاں نواز بھی آئی کہ فَاِنَّکَ بِاَعْیُنِنَا (اس لیے کہ تم ہماری نگاہوں کے سامنے ہو) اللہ رب العالمین کی نگاہوں میں ہونا، اور اس کے قریب ہونا ایک ہی حقیقت کی دو مختلف تعبیریں ہیں۔ پس اس ارشادِ خداوندی سے یہ راز منکشف ہوا کہ اللہ تعالیٰ کے قرب میں طمانیت ہی طمانیت ہے۔ اور یہ بات معلوم ہی ہو چکی ہے کہ یہ قرب حاصل جس شے سے ہوتا ہے وہ نماز اور صرف نماز ہے۔ چنانچہ خود یہاں بھی فوراً ہی بعد یہ الفاظ آتے ہیں کہ وَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّکَ حِیْنَ تَقُوْمُ وَمِنَ اللَّیْلِ فَسَبِّحْہُ وَاِدْبَارَ النُّجُوْمِ (اور اپنے رب کی حمد کرتے ہوئے اس

کی تسبیح کیا کرو، اس وقت جب کہ تم اٹھتے ہو، اور رات کے اوقات میں بھی تسبیح کرتے رہو، اور ستاروں کے جھک جانے کے بعد بھی (سورۂ نجم) گویا اللہ رب العزت کی پناہ حاصل کرنے کا ذریعہ اس کی حمد و تسبیح، یا دوسرے لفظوں میں نماز ہے۔

(۵) لِيَكُونَ الرَّسُولُ شَهِيدًا عَلَيْكُمْ وَتَكُونُوا شُهَدَاءَ عَلَى النَّاسِ فَأَقِيمُوا الصَّلٰوةَ وَآتُوا الزَّكٰوةَ (ج-۸۰)	تاکہ پیغمبر تم پر (حق کا) گواہ ہو اور تم دوسرے تمام لوگوں کے سامنے اس حق کے گواہ بنو، پس نماز قائم اور زکوٰۃ ادا کرتے رہو۔

اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ دین حق کی شہادت اور علم برداری کا وہ فرض گراں جس کی ادائگی امت مسلمہ کا تنہا مقصد وجود ہے، اسی وقت سرانجام پاسکتا ہے جب کہ نماز اور زکوٰۃ کی ٹھیک ادائگی ہوتی رہے، اور اگر امت اپنے اس فرض کو اپنی زندگی کا نصب العین قرار دینا اور برقرار رکھنا چاہتی ہے تو جو کام اسے سب سے اول اور سب سے آخر کرنا ہے وہ اقامت نماز اور ادائے زکوٰۃ ہے۔ یہی وہ شاہراہ ہے جو شہادت حق کی منزل مقصود تک پہنچتی ہے۔ قدم اس صراط مستقیم سے اگر ذرا ہٹے، تو دنیا کے ہر مقصود تک رسائی ہو سکتی ہے مگر جس مقصود کا نام شہادت حق ہے، اس تک رسائی کسی حال میں نہیں ہو سکتی۔

آیت زیر بحث میں نماز کے ساتھ زکوٰۃ کا بھی ذکر ہے، مگر اس سے شہادت حق کے باب میں نماز کے مدار اصلی ہونے پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ اس لیے کہ ایک تو نماز کے ذکر کو زکوٰۃ پر مقدم رکھا گیا ہے، جو اس کی اولیت اور بنیادی اہمیت پر دلالت کرتا ہے، دوسرے زکوٰۃ اپنی حقیقت کے اعتبار سے دراصل نماز ہی کا فیضان ہے، کیونکہ زکوٰۃ کی بنیاد عدل اور احسان ہے اور نماز ہی عدل و احسان کا اصل معلم ہے، اور زکوٰۃ ہی پر کیا منحصر ہے، شریعت کے تو سارے ہی احکام کا سر عنوان، ان کے وجود کا سر چشمہ اور ان کا محافظ صرف یہی نماز ہے، جس کی تفصیل اوپر کی سطر میں گذر چکی۔

(۶) وَلَقَدْ اَخَذَ اللّٰهُ مِيْثَاقَ بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ وَبَعَثْنَا مِنْهُمُ اثْنَيْ عَشَرَ نَقِيْبًا وَقَالَ اللّٰهُ اِنِّيْ مَعَكُمْ لَئِنْ اَقَمْتُمُ الصَّلٰوةَ ...... لَاُكَفِّرَنَّ عَنْكُمْ سَيِّاٰتِكُمْ وَلَاُدْخِلَنَّكُمْ جَنّٰتٍ الخ (مائدہ ۵۔۱۲)

اور اللہ نے بنی اسرائیل سے (اپنی بندگی کا) عہد لیا تھا، اور ہم نے ان میں سے ان کے اندر بارہ نقیب مقرر کیے۔ اور اللہ نے اعلان فرما دیا تھا کہ میں تمہارے ساتھ ہوں اگر نماز قائم رکھو گے ... تو میں تمہاری برائیوں کو جھاڑ دوں گا اور تمہیں باغوں میں داخل کروں گا۔ الخ

گذشتہ آیت نے اگر ہمیں اس ضابطہ خداوندی سے روشناس کرایا تھا کہ خدا پرستی، دین کی علم برداری اور حق کی شہادت کا تمام تر دار و مدار نماز کی

اقامت پر ہے تو یہ آیت ہمیں ایک قدم اور آگے لے جاتی ہے اور اسی طرح کے ایک اور ضابطۂ خداوندی سے باخبر کرتی ہے، جس کو ضابطۂ بالا کا توأم ضابطہ کہنا چاہیے یہ بتاتی ہے کہ شہادت حق کی جانکاہ مہم میں نصرتِ غیبی کے ذرائع کے اندر سرفہرست نماز ہے۔ پس نماز کی اقامت صرف اسی لیے ضروری نہیں ہے کہ اسی سرچشمہ سے شہادت حق کی بھاری ذمہ داری اُٹھانے کی قوت اور صلاحیت ملتی ہے، بلکہ اس لیے بھی ضروری ہے کہ اس مہم میں کامیابی بھی یہی دلاتی ہے

یہ ہیں اہمیتِ نماز کے چند بہت نمایاں پہلو جو آیات قرآنی کی روشنی میں ہر صاحبِ نظر کو بادنی تامل دکھائی دے سکتے ہیں۔ اگر آپ پورے قرآن کا اس نقطۂ نظر سے مطالعہ کر جائیں کہ اس نے نماز کی ضرورت، اہمیت، افادیت اور تاثیر کے کتنے پہلوؤں کی طرف اشارے کیے ہیں تو شاید ان کا شمار بھی آپ کے لیے مشکل ہوگا، اور اس کی عظمتوں کا اندازہ کرتے ہوئے آپ کا ذہن تھک جائے گا۔ مگر ہم اتنے ہی پہلوؤں کے ذکر پر اکتفا کرتے ہیں، اس لیے کہ اصولی اور بنیادی طور پر ان کی حیثیت دوسرے پہلوؤں کے مقابلہ میں ایک خاص امتیاز رکھتی ہے۔ اور وہ یوں کہ باقی دوسرے پہلو قریب قریب سب کے سب ان ہی کی شرح و تفصیل ہیں، اس لیے اہمیت نماز کے کلی تعارف کے لیے بھی یہی چند پہلو بڑی حد تک کفایت

کرتے ہیں۔

نماز کی اس حقیقت اور اس کی اس اہمیت کو اچھی طرح ذہن نشین رکھیے اور پھر اس سوال پر غور فرمائیے کہ اساس دین کی تعمیر میں نماز کو بنیادی حیثیت کیوں حاصل ہے؟ بشرطیکہ اب بھی یہ سوال سوال ہو اور اس پر غور کرنے کی ضرورت ہو۔ ورنہ جو شے احکامِ دین کا سرعنوان ہو، جو شریعت کے پورے مجموعے کا سرچشمۂ وجود اور جوہرِ حیات ہو، جو سارے احکام و شرائع کے لیے حصن حصین ہو، جو قلب انسانی کو نور اور سکینت سے بھر دینے والی ہو، جو محبوبِ حقیقی سے قرب اور ہم کلامی کا اعزاز بخشنے والی ہو، جو حق پرستی کی صبر آزما ابتلاؤں میں دلوں کو مضبوط اور قدموں کو استوار رکھنے والی ہو، جس پر شہادتِ حق کی ادائگی کا انحصار ہو، جس پر ملّی خوش بختیوں اور سربلندیوں کا دارومدار ہو، اور سب سے آخر میں یہ کہ جس کے وجود و قیام پر پورے دین کا وجود و قیام موقوف ہو اور جس کے ڈھ جانے پر دین کا پورا ایوان زمین بوس ہو جاتا ہو —— ایسی شے کے بارے میں اس سوال کی گنجائش باقی ہی کہاں رہ جاتی ہے کہ وہ اساس دین کی تعمیر میں خشتِ اوّل کی حیثیت کیوں رکھتی ہے؟ کھلی بات ہے کہ دینِ حق کی اطاعت و اقامت ایمان باللہ اور ایمان بالآخرت پر منحصر ہے۔ اللہ تعالیٰ کی ذات و صفات کی انسان کو جتنی ہی زیادہ گہری معرفت ہوگی اور آخرت کی جواب دہی کا جتنا ہی زیادہ پختہ یقین ہوگا اتنا ہی زیادہ وہ احکام الٰہی کے اتباع میں

سرگرم، اور شہادتِ حق ——— اقامتِ دین ——— کے ادائے فرض میں کوشاں ہو گا۔ یہ ایمان بلاشبہ سمع و بصر اور فواد کے صحیح استعمال ہی سے پیدا ہوتا ہے، اور آفاق و انفس کے دلائل اور آیاتِ کائنات کے بصائر اس میں بڑی گہرائی، بڑی پختگی اور بڑی توانائی پیدا کرتے رہتے ہیں، جیسا کہ پہلے ہم بیان کر چکے ہیں، مگر واقعہ یہ ہے کہ جو چیز اس ایمان کو "ایمان" بناتی ہے وہ یہی ذکر و نماز ہے۔ عقل کی جستجوئیں، فطرت کی شہادتیں، کائنات کی دلیلیں، آفاق کی گواہیاں اور انفس کی صدائیں جس ایمان کو پیدا کرتی ہیں اس کی حیثیت بس ایک اچھے بیج کی سی ہے۔ آپ جتنا ہی زیادہ غور و تدبر سے کام لیں گے اور زمین و آسمان کی بکھری ہوئی نشانیوں پر تفکر کی جس قدر گہری نگاہیں ڈالیں گے اتنا ہی زیادہ یہ "بیج" تندرست اور صالح ہو گا۔ لیکن کسی بیج کا تندرست اور صالح ہونا اس بات کے لئے ہرگز کافی نہیں ہے کہ وہ آج ایک شاداب و ہونہار پودے، اور کل ایک تناور اور بار آور درخت کو بھی جنم دے دے گا، بلکہ اس کے لئے اچھی اور موزوں آبپاشی کی بھی ضرورت ہے۔ تخم ایمان کے سیراب کیے جانے کے لیے حق تعالیٰ نے جس "آبِ مبارک" کو نازل فرمایا ہے اس کا نام نماز ہے۔ یہ نماز ایمان باللہ اور ایمان بالآخرت کو بھی اسی طرح پروان چڑھاتی اور انہیں ثمر بار بناتی ہے جس طرح پانی نباتات کو۔ یہی وجہ ہے کہ ایمان باللہ اور ایمان بالآخرت دونوں کو مضبوط اور زندگی کی توانائیوں سے معمور بنانے کی تدابیر میں ذکر و نماز کو ایک

کرتے ہیں۔

نماز کی اس حقیقت اور اس کی اس اہمیت کو اچھی طرح ذہن نشین رکھیے اور پھر اس سوال پر غور فرمائیے کہ اساس دین کی تعمیر میں نماز کو بنیادی حیثیت کیوں حاصل ہے؟ بشرطیکہ اب بھی یہ سوال سوال ہو اور اس پر غور کرنے کی ضرورت ہو۔ ورنہ جو شے احکام دین کا سرعنوان ہو، جو شریعت کے پورے مجموعے کا سرچشمۂ وجود اور جوہرِ حیات ہو، جو سارے احکام و شرائع کے لیے حصن حصین ہو، جو قلب انسانی کو نور اور سکینت سے بھر دینے والی ہو، جو محبوب حقیقی سے قرب اور ہم کلامی کا اعزاز بخشنے والی ہو، جو حق پرستی کی صبر آزما ابتلاؤں میں دلوں کو مضبوط اور قدموں کو استوار رکھنے والی ہو، جس پر شہادتِ حق کی ادائگی کا انحصار ہو، جس پر ملی خوش بختیوں اور سربلندیوں کا دارومدار ہو، اور سب سے آخر میں یہ کہ جس کے وجود و قیام پر پورے دین کا وجود و قیام موقوف ہو اور جس کے ڈھ جانے پر دین کا پورا ایوان زمین بوس ہو جاتا ہو —— ایسی شے کے بارے میں اس سوال کی گنجائش باقی ہی کہاں رہ جاتی ہے کہ وہ اساس دین کی تعمیر میں خشتِ اوّل کی حیثیت کیوں رکھتی ہے؟ کھلی بات ہے کہ دین حق کی اطاعت و اقامت ایمان باللہ اور ایمان بالآخرت پر منحصر ہے۔ اللہ تعالیٰ کی ذات و صفات کی انسان کو جتنی ہی زیادہ گہری معرفت ہو گی اور آخرت کی جواب دہی کا جتنا ہی زیادہ پختہ یقین ہو گا اتنا ہی زیادہ وہ احکام الٰہی کے اتباع میں

سرگرم، اور شہادتِ حق —— اقامتِ دین —— کے ادائے فرض میں کوشاں ہو گا۔ یہ ایمان بلاشبہ سمع و بصر اور فواد کے صحیح استعمال ہی سے پیدا ہوتا ہے، اور آفاق و انفس کے دلائل اور آیات کائنات کے بصائر اس میں بڑی گہرائی، بڑی پختگی اور بڑی توانائی پیدا کرتے رہتے ہیں، جیساکہ پہلے ہم بیان کر چکے ہیں، مگر واقعہ یہ ہے کہ جو چیز اس ایمان کو "ایمان" بناتی ہے وہ یہی ذکر و نماز ہے۔ عقل کی جستجوئیں، فطرت کی شہادتیں، کائنات کی دلیلیں، آفاق کی گواہیاں اور انفس کی صدائیں جس ایمان کو پیدا کرتی ہیں اس کی حیثیت بس ایک اچھے بیج کی سی ہے۔ آپ جتنا ہی زیادہ غور و تدبر سے کام لیں گے اور زمین و آسمان کی بکھری ہوئی نشانیوں پر تفکر کی جس قدر گہری نگاہیں ڈالیں گے اتنا ہی زیادہ یہ "بیج" تندرست اور صالح ہو گا۔ لیکن کسی بیج کا تندرست اور صالح ہونا اس بات کے لئے ہرگز کافی نہیں ہے کہ وہ آج ایک شاداب و ہونہار پودے، اور کل ایک تناور اور بار آور درخت کو بھی جنم دے دے گا، بلکہ اس کے لئے اچھی اور موزوں آبپاشی کی بھی ضرورت ہے۔ تخمِ ایمان کے سیراب کیے جانے کے لیے حق تعالیٰ نے جس "آبِ مبارک" کو نازل فرمایا ہے اس کا نام نماز ہے۔ یہ نماز ایمان باللہ اور ایمان بالآخرت کو بھی اسی طرح پروان چڑھاتی اور انہیں ثمر بار بناتی ہے جس طرح پانی نباتات کو۔ یہی وجہ ہے کہ ایمان باللہ اور ایمان بالآخرت دونوں کو مضبوط اور زندگی کی توانائیوں سے معمور بنانے کی تدابیر میں ذکر و نماز کو ایک

خاص اور ممتاز حیثیت حاصل ہے۔

اس حقیقت کی سب سے بڑی شہادت خود وہ ہدایات ہیں جو اللہ تعالےٰ کی جناب سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی ابتدائے بعثت ہی سے دی گئی تھیں، ارشاد ہوا کہ:۔

يَا أَيُّهَا الْمُزَّمِّلُ قُمِ اللَّيْلَ إِلَّا قَلِيلًا نِصْفَهُ أَوِ انْقُصْ مِنْهُ قَلِيلًا أَوْ زِدْ عَلَيْهِ وَرَتِّلِ الْقُرْآنَ تَرْتِيلًا إِنَّا سَنُلْقِي عَلَيْكَ قَوْلًا ثَقِيلًا إِنَّ نَاشِئَةَ اللَّيْلِ هِيَ أَشَدُّ وَطْئًا وَأَقْوَمُ قِيلًا (مزمل)	اے کمبل میں لپٹنے والے! کچھ حصہ کے سوا باقی رات بھر نماز میں کھڑے رہا کرو، یعنی نصف شب تک، یا اس میں کچھ کم کرو یا کچھ زیادہ اور اس میں، قرآن کو خوب ٹھیر ٹھیر کر پڑھو، اس لئے کہ ہم تم پر ایک بھاری بات کی ذمہ داری ڈالنے والے ہیں۔ بلاشبہ رات کا اٹھنا قدموں کے جماؤ کے لحاظ سے بھی خوب تر ہے اور زمنہ سے نکلنے والی باتوں کی درستگی کے لحاظ سے بھی۔

ظاہر ہے کہ اس "بھاری بات" سے مراد تبلیغ دین اور تبلیغ دین سے بڑھ کر اقامت دین کی ذمہ داری ہے۔ اس بار گراں کے اٹھانے کے لیے نبی کو تیار ہونے کا ذریعہ جہاں یہ بتایا جارہا ہے کہ وہ رات کا زیادہ سے زیادہ حصہ تہجد کی نماز میں گذاریں، وہیں اس امر کی بھی تلقین کی جارہی ہے کہ اس نماز میں قرآن ٹھیر ٹھیر کر پڑھیں۔ یہ "ٹھیر ٹھیر کر پڑھنا" ایک بڑی ہی عظیم الشان

حقیقت دین کا حامل ہے، اور اسی پر ٹھہر ٹھہر کر غور کرنے والا وہ پُرحکمت طریقہ معلوم کر لے سکتا ہے جو قرآن نے ایمان کی تقویت اور قلب کے تزکیہ کے لیے ٹھہرایا ہے۔ ٹھہر ٹھہر کر پڑھنے کا مدعا یہ ہے کہ اس کامل یکسوئی کے عالم میں انسان آیات قرآنیہ پر گہرا تدبر کرے، ان آیات قرآنیہ پر، جن کے اندر اللہ تعالیٰ کی ذات وصفات اور روز جزا پر اطمینان بخش دلائل موجود ہیں، جو رحمت الٰہی کے دل آویز اور سپاس انگیز تذکروں سے لبریز ہیں جو حمد و تقدیس کے جذبات، اور بندگی کے احساسات کے لیے پیام بیداری ہیں۔ یہ تدبر انسان کے دل میں ایمانی کیفیت کو جس طرح تیز کر سکتا ہے اس کا فکر و نظر کر کیا! نماز وہ! بلاشبہ نماز سے باہر بھی قرآن کو پڑھنا چاہیے اور وہ پڑھا بھی جاتا ہے، مگر بھولنا نہ چاہیے کہ اس وقت بندہ نہ تو بندگی کی حیثیت میں ہوتا ہے، نہ اپنے رب سے سرگرم مناجات ہوتا ہے، اس لیے اس تلاوت کا، جو نماز میں ہوتی ہے، اس تلاوت سے، جو دوسرے اوقات میں ہوتی ہے، کوئی مقابلہ نہیں کیا جا سکتا۔ نماز کے اندر قرآن کی اثر انگیزی اپنی مثال آپ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآنی اشارات کے مطابق تلاوت قرآن کا صحیح اور اصلی موقع صرف نماز ہے، بالخصوص نماز تہجد اور نماز فجر۔ اس لیے کہ یہ وقت ہی کچھ ایسا ہوتا ہے جس میں ذہن میں سکون، دل میں یکسوئی، اور روح میں ایک خاص کیفیت انجذاب ہوتی ہے، جیسا کہ اس آیت کا آخری ٹکڑا بتا رہا ہے اور ہر تدبر سے کام لینے والا

تجربہ گواہی دیتا ہے: اِنَّ قُرْآنَ الْفَجْرِ كَانَ مَشْهُودًا۔

نماز کا معیارِ مطلوب

نماز کی ان پُرعظمت اہمیتوں نے اس کا یہ استحقاق پوری طرح ثابت کر دیا کہ وہ اساس دین کی تعمیر میں خشت اوّل کی حیثیت رکھتی ہے۔ لیکن اس جگہ پہنچ کر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ وہ کون سی نماز ہے جس کی یہ اہمیّت اور یہ عظمت ہے؟ یہ سوال اس لیے اور بھی پیدا ہوتا ہے کہ نماز کی جو حقیقت، اہمیت اور عظمت بیان کی گئی ہے، وہ اگرچہ نظری طور پر ناقابل انکار ہے، مگر عملی اور واقعاتی دنیا کا جائزہ اس نظری جائزے کی ہمنوائی کرنے پر کھل کر تیار نہیں ہوتا۔ جو بے نمازی ہیں انہیں تو چھوڑیے، جو نمازیں پڑھنے والے ہیں ان کی زندگیاں بھی اس امر کی شہادت دیتی نظر نہیں آتیں کہ نماز کی ادائگی سارے احکام دین کی ادائگی کے ہم معنی ہے۔ وہ نمازیں بھی پڑھتے ہیں اور ساتھ ہی ان کے ایوان شریعت کے اکثر و بیشتر حصّے مسمار بھی پڑے ہیں، اور یہ "نمازیں" ان حصّوں کی تعمیر کا ان سے کوئی مطالبہ نہیں کرتیں۔ اسی طرح وہ نمازیں تو پڑھتے ہیں مگر ان کے خیال اور ان کے تجربے میں یہ نمازیں ان کے واسطے طمانیت قلب اور پاکیزگی نفس کے لیے کافی کامیاب ذریعہ نہیں ہیں، اور انہیں اس غرض کے لیے کچھ روحانی اجتہادات کی ضرورت پڑتی ہے، وہ مجبور ہوتے ہیں کہ ذکر الٰہی کے کچھ دوسرے نو دائرہ طریقے تلاش اور اختیار کریں۔ اس لیے ضرورت ہے کہ اس نماز کا عام معیار

مطلوب معلوم کرلیا جائے جو دین کا مرکزی ستون اور سنگِ اساس بھی ہے
اور ذکر کامل کی حیثیت سے طمانیت قلب کا تنہا وسیلہ بھی۔

اس سلسلہ میں سب سے پہلے یہ بنیادی بات جان لینی چاہیے کہ قرآن
نے نماز کی محافظت کرنے اور اس کے قائم کرنے کا حکم دیا ہے، صرف پڑھنے
کا نہیں۔ نماز قائم کرنا اور چیز ہے اور نماز پڑھنا اور شے۔ کپڑے کو کسی عمدہ
صابون سے اچھی طرح دھونا اور بات ہے اور اس کو جیسے تیسے پانی میں
محض ڈبو کر نچوڑ لینا دوسری بات ہے۔ نماز پڑھنا تو یہ ہے کہ وقت، جماعت،
تعدیل ارکان، حضور قلب، خشوع باطن اور تدبر قرآن کی قیود سے کلاً یا جزاً بے
نیاز ہو کر پڑھی جائے، لیکن محافظت و اقامت نماز کے اندر ان چیزوں کا
وجود لازماً شامل ہے۔

چنانچہ نماز کے متعلق جہاں یہ بات فرمائی گئی ہے کہ "وقت کی پابندی
کے ساتھ مومنوں پر فرض ہے (اِنَّ الصَّلٰوۃَ کَانَتْ عَلَی الْمُؤْمِنِیْنَ
کِتٰبًا مَّوْقُوْتًا") وہیں اس سے پہلے یہ بھی کہا گیا ہے کہ "(فَاَقِیْمُوا الصَّلٰوۃَ)
نماز قائم کرو" کلام کا یہ نظم اور سیاق بتاتا ہے کہ وقت کی پابندی منجملہ شرائط اقامت
کے ہے، اور اس سے تغافل اضاعتِ نماز کے ہم معنی۔

پھر اگر آپ پورے فقرے کو غور کے ساتھ پڑھیں جس کا یہ جملہ ایک ٹکڑا
ہے، تو آپ کو قیام جماعت کی بھی شرعی اہمیت کا بخوبی اندازہ ہو جائے گا۔

اس فقرے میں میدان جنگ کی نماز کا طریقہ بتایا گیا ہے، اور بات یوں شروع ہوتی ہے کہ جب تم سفر میں نکلو تو اس میں کوئی مضائقہ نہیں کہ اپنی نمازوں کو کم کردو، اگر تمہیں اس بات کا اندیشہ ہو کہ کفار تمہیں مصیبت میں ڈال دیں گے (وَاِذَا ضَرَبْتُمْ فِی الْاَرْضِ فَلَیْسَ عَلَیْکُمْ جُنَاحٌ اَنْ تَقْصُرُوْا مِنَ الصَّلٰوۃِ اِنْ خِفْتُمْ اَنْ یَّفْتِنَکُمُ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا) پھر آگے چل کر ارشاد ہوتا ہے کہ "اے نبی! اگر تم بہ نفس نفیس خود ان میں موجود ہو اور انہیں نماز پڑھاؤ تو چاہیے کہ ان میں کا ایک گروہ تمہارے پیچھے اپنے اسلحے لیے ہوئے نماز پڑھنے کھڑا ہو جائے اور دوسرا گروہ دشمن کے مقابل رہے، جب پہلا گروہ ایک رکعت پوری کرے تو دوسرے کی جگہ دشمن کے سامنے آ کھڑا ہو اور دوسرا گروہ آکر تمہارے پیچھے نماز میں کھڑا ہو جائے۔" اس سے نہ صرف نماز ہی کی اہمیت معلوم ہوتی ہے بلکہ التزام جماعت کی شدت ضرورت بھی روشنی میں آتی ہے۔ اس کے بعد جب ہماری نظر ان الفاظ پر پڑتی ہے کہ "فَاِذَا اطْمَاْنَنْتُمْ فَاَقِیْمُوا الصَّلٰوۃَ" (جب تمہاری یہ حالت خوف باقی نہ رہے تو نماز قائم کرو) تو جماعت کی پابندی صرف ایک شدید ضرورت ہی نہیں رہ جاتی بلکہ وہ واضح طور پر اقامت نماز کے شرائط میں داخل ہو جاتی ہے۔

رہی یہ بات کہ تعدیل ارکان اور سکون قلب، نماز کی اقامت اور محافظت کا کس طرح ضروری جزو ہے، تو اس کے لیے سورہ بقرہ کی

...nkana
...ahib.
...RARY...

آیت "حَافِظُوا عَلَى الصَّلَوَاتِ وَالصَّلوٰةِ الْوُسْطٰى وَقُوْمُوا لِلّٰهِ قَانِتِيْن" (محافظت کرو اپنی نمازوں کی، اور بہترین نماز کی، کھڑے ہو اللہ کے لیے ادب و نیاز میں ڈوبے ہوئے)۔ ایسی کافی وضاحت فراہم کرتی ہے جس پر کسی اضافے کی ضرورت نہیں۔

اسی طرح خشوعِ باطن کا شرائط اقامت میں ہونا بھی معروف و مسلم حقیقت ہے۔ سورہ المومنون کی ابتدائی آیات اور سورۂ بقر کی آیت (۴۶) کا حوالہ اوپر گذر چکا ہے، ان آیات میں خشوع اور انابت کو نماز کی بنیاد اور اس کا حاصل ٹھیرایا گیا ہے۔

رہ گیا تدبرِ قرآن کا اقامت نماز کے لوازم میں سے ہونا، تو اس کے ثبوت کے لیے سورۂ مزمل کی ان آیتوں پر پھر ایک بار نظر ڈال لیجیے جن کے الفاظ ابھی ابھی ہم نے آپ کے سامنے رکھے ہیں، اور جن کا انداز صاف کہتا ہے کہ اگر قرآن کو پڑھنا ہو تو اس کا سب سے موزوں وقت نماز ہے۔ قرآن کے بعد اگر آپ احادیث اور اسوۂ رسول کی طرف متوجہ ہوں تو آپ کو ان حقائق کی بسیر حاصل تفصیلات ملیں گی، جنہیں ہم بخوفِ طوالت نظر انداز کرتے ہیں۔

پس یہ چیزیں اگر نماز میں موجود نہ ہوں اور وہ سب سے، یا ان میں سے ایک دو سے، خالی ہو تو یہ نماز کا قائم کرنا اور ان کی محافظت۔

کرنا نہ ہوگا۔ ایسی نماز نہ تو دین کی سچی بنیاد ہوگی، نہ اس سے آپ ان ثمرات کی کبھی توقع کر سکتے ہیں جو قائم کی جانے والی نماز کے ثمرات ہیں۔ یہ نماز اعمال خیر کا سرچشمہ کیا بنے گی؟ یہ تو شیطانِ نفس کے ایک حملے کی بھی تاب نہیں لا سکتی۔ بنی اسرائیل کی تاریخِ عبرت ہمارے سامنے ہے۔ وہ بتاتی ہے کہ انہوں نے چونکہ نماز ضائع کر دی تھی اس لیے ان کی زمامِ فکر و عمل شہواتِ نفس کے ہاتھوں میں جا پڑی "اَضَاعُوا الصَّلٰوةَ وَاتَّبَعُوا الشَّهَوَاتِ" اور یہ بات کچھ ڈھکی چھپی نہیں کہ نفس کی پیروی اور دین کے انہدام میں دوری بہت تھوڑی ہے۔

اہتمامِ نماز کی ضرورت۔

اب ہمیں بحث و نظر کی بیرونی سرحدوں سے ہٹ کر خود اپنے قریب آ جانا چاہیے۔ ہر وہ مسلمان جو اپنے دین کی بنیادوں کو صحیح طرز پر تعمیر کرنا چاہتا ہے، ان تفصیلات کے بعد ایک سنجیدہ فکر میں ڈوب جائے گا، اور کوئی وجہ نہیں کہ ہم بھی نہ ڈوب جائیں اور اپنے آپ سے خود یہ نہ پوچھیں کہ ہماری نمازیں کیسی ہوتی ہیں؟ آیا وہ پڑھی جاتی ہیں یا قائم بھی کی جاتی ہیں؟ ہو سکتا ہے کہ اس سوال کا جواب کچھ ناپسندیدہ سا ہو، مگر اس کے باوجود اسے ہونا چاہیے، تاکہ ہم اپنے آپ کو پہچان تو جائیں، کہ یہی خود آگاہی دراصل کامیابی کی شاہ کلید ہے۔ ہمارے سامنے ایک طرف تو نماز کی یہ حقیقت اور اہمیت ہے، دوسری

طرف اس کی یہ خصوصیات ہیں، تیسری طرف اس کے بہت سے لازمی ثمرات و نتائج ہیں (مثلاً یہ کہ وہ پیروی نفس سے باز رکھتی اور فحشاء و منکر سے روکتی ہے، دل کو اطمینان کی ٹھنڈک بخشتی ہے، مشکلات میں تحمّل اور استقلال کی قوت بہم پہنچاتی ہے، اور انسان کو نیکوکار اور پابند شرع بناتی ہے وغیرہ) جو نہ صرف نماز کے لازمی ثمرات و نتائج ہی ہیں بلکہ اس کی درستی کی ایک کھلی کسوٹی بھی ہیں، چوتھی طرف پہاڑ سے بھاری یہ حقیقت ہے کہ نبی کے لیے بھی فرائض نبوّت کے بارِ گراں کا تحمّل نماز کے بغیر ممکن نہ ہوا اور ضرورت محسوس ہوئی کہ وہ بھی نماز سے کسب توانائی کریں، اور نہ صرف عام فرض نمازوں ہی سے، بلکہ آخر شب کی تہجد اور فجر کی طویل نمازوں سے بھی —— یہ ساری باتیں ہم سے کچھ مطالبہ کرتی اور ہمارے لیے ایک راہِ عمل معیّن کرتی ہیں، اور وہ یہ کہ ہم بلا تاخیر اپنی نمازوں کا جائزہ لے کر دیکھیں کہ وہ کہاں تک "نماز" ہیں۔ پھر ان میں جس پہلو سے جو خامیاں نظر آئیں ان کی اصلاح کی فکر کریں، اور یہ جائزہ اور فکرِ اصلاح مسلسل ہو۔ ہمیں یاد رکھنا چاہیے کہ جو کام —— طاعت حق اور اقامت دین کا کام —— نبی اور اصحاب نبی کی بھی رات کی میٹھی نیندوں کو قربان کیے بغیر نہ ہو سکا وہ ہم اور آپ صرف پنج وقتہ نمازوں کو بس قانونی انداز میں ادا کر کے قیامت تک نہ کر سکیں گے۔ پس آپ اپنی نمازوں پر اک ذرا گہری نگاہ ڈال کر اندازہ لگائیے کہ یہ نمازیں کہاں تک آپ کے دین کی بنیاد کو مضبوط بنا رہی اور آپ کو فریضۂ اقامتِ دین سے

عہدہ برآ ہونے کی طاقت بہم پہنچا رہی ہیں۔ یہ اندازہ آپ کریوں ہو گا کہ جس حد تک آپ ان نمازوں میں خشوع پائیں، وقت اور جماعت کا اہتمام دیکھیں، رکوع و سجود میں قرار و سکون کا مشاہدہ کریں، قرأتِ قرآن میں طول، اور آیاتِ قرآن میں تدبّر و تفکّر محسوس کریں، بس قیاس کر لیجئے کہ اسی حد تک یہ نمازیں آپ کو ایمان کی طاقت دے رہی ہیں، اور اسی حد تک آپ پیروی دین کے ادعا کو نبھانے کے قابل بن رہے ہیں۔

نمازِ تہجّد کا اہتمام

اس موقع پر نمازِ تہجّد کی مخصوص اہمیّت ہماری مخصوص توجہ کی سزاوار ہے، گو یہ نماز امت پر فرض نہیں ہے، مگر اس کی یہ نوعیت صرف قانون کی حد تک ہے خصوصاً ان لوگوں کے حق میں جو عوام میں سے نہیں، اور جو شہادتِ حق اور اقامتِ دین کا علم تھامے ہوں، جن کی راہِ عمل رخصت کی نہیں بلکہ عزیمت کی ہو۔ یہ نماز عام امت پر اگر فرض نہیں کی گئی تو اس کی توجیہ صرف یہ تھی کہ وہ ایک غیر معمولی مشقت کی موجب تھی، اس لیے اس کی بے مثل اثر آفرینیوں کے باوجود شارعِ رحمان و رحیم نے اس کو فرض نہیں قرار دیا، جیسا کہ اس کا اصولِ تشریع چاہتا تھا، مگر اس کے باوجود اس کے کلام میں اس نماز کی جیسی کچھ ترغیب دی گئی ہے وہ کسی صاحبِ نظر سے مخفی نہیں۔ مثالی مومنوں کی جب وہ صفات گناتا ہے تو بات پوری نہیں ہوتی جب تک کہ وہ اس طرح کے الفاظ نہیں

کہہ لیتا:۔

(۱) تَتَجَافیٰ جُنُوبُهُمْ عَنِ الْمَضَاجِعِ (سجدہ) — ان کے پہلو راتوں کو بستروں سے دور ہوتے ہیں۔

(۲) "کَانُوا قَلِیْلًا مِّنَ اللَّیْلِ مَا یَهْجَعُونَ" (ذاریات) — وہ راتوں میں بہت کم سوتے تھے۔

(۳) "الَّذِیْنَ یَبِیْتُونَ لِرَبِّهِمْ سُجَّدًا وَّقِیَامًا"۔ (فرقان) — جو اپنی راتیں اپنے رب کے حضور سجدہ و قیام میں گذار دیتے ہیں

پس یہ صحیح ہے کہ یہ نماز فرض نہیں، مگر یہ بھی غلط نہیں کہ یہ الفاظ جو مثالی ایمان کے نمایاں خط و خال کی حیثیت رکھتے ہیں، یہ بھی کچھ معنی رکھتے ہیں۔ ضرورت ہے کہ اس معنی پر غور کیا جائے اور اسے سمجھنے کی کوشش کی جائے۔ پھر یہ بات تو کسی طرح بھی نظر انداز نہیں کی جا سکتی کہ تبلیغ دین کی مہم سر کرنے کے لیے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو جس طرح عام نمازوں کی اقامت کا حکم دیا گیا اسی طرح قُمِ اللَّیْلَ اِلَّا قَلِیْلًا کی ہدایت بھی فرمائی گئی، اور اس قیام لیل (یعنی نماز تہجد) کی اہمیت و تاثیر پہ یہ کہ کر مہر تصدیق ثبت کر دی گئی کہ اِنَّا سَنُلْقِیْ عَلَیْکَ قَوْلًا ثَقِیْلًا "ہم تم پر ایک بھاری بات کا بوجھ ڈالنے والے ہیں"، جب کہ پورے قرآن میں کہیں کسی بھی نماز کے ذکر کے ساتھ ایسا نہیں فرمایا گیا۔ کیا یہ اس حقیقت کا اعلان نہیں کہ "قول ثقیل"

کی گرانبار زیوں کی قوت برداشت خصوصیت کے ساتھ نماز تہجد ہی سے پیدا ہوتی ہے؟

عام اذکار عام نمازوں کے سوا جس طرح نماز تہجد کو ارتقائے باطن کے باب میں خاص دخل ہے اور شریعت نے اس کی ترغیب دینے میں کوئی پہلو نظرانداز ہونے نہیں دیا ہے، اسی طرح کچھ خاص دعائیں اور چند خاص اذکار بھی ہیں جن کے پڑھتے رہنے کی اس نے زبردست سفارش کی ہے۔ تزکیۂ باطن اور تقویت ایمان کے سلسلہ میں ان اذکار و اوراد ماثورہ کا حال تہجد ہی جیسا ہے، یعنی قانون کی زبان سے تو ان کو فرض اور واجب نہیں کہا گیا ہے، لیکن افادۂ ایمانی کی زبان سے ان کو ایسا ہی کچھ بتایا گیا ہے۔ قرآن نے جس طرح بندگان حق کی صفت یہ بتائی ہے کہ وہ میٹھی نیند کے مزے چھوڑ کر رات کی کتنی ہی گھڑیاں رکوع و سجود میں گذار دیتے ہیں، اسی طرح ان کا ایک عام وصف یہ بھی بتایا ہے کہ وہ بالعموم اللہ کا نام لیتے رہتے ہیں یعنی بزبان حال و بزبان قلب تو اللہ کی یاد ان کا دوامی وظیفہ زندگی ہے ہی، بزبان قال بھی اللہ تعالےٰ کی حمد و تسبیح ان کے شب و روز کے مختلف اوقات کا محبوب ترین مشغلہ ہے (یَذْكُرُوْنَ اللّٰهَ قِيَامًا وَّقُعُوْدًا وَّعَلٰى جُنُوْبِهِمْ) وہ اللہ تعالیٰ کی رحمتوں سے لو لگائے اور محاسبۂ اعمال کے خوف سے لرزتے ہوئے اس سے دعائیں اور التجائیں کرتے رہتے ہیں (يَدْعُوْنَ رَبَّهُمْ خَوْفًا وَّ

طَمَعًا) رات کی خوابیدہ ساعتوں میں اگر وہ محو نماز ہوتے ہیں تو سپیدۂ صبح کی نمود ان کو توبہ واستغفار میں مشغول پاتی ہے (وَبِالْاَسْحَارِ هُمْ يَسْتَغْفِرُوْنَ) معلوم ہوا کہ یہ حمد و تسبیح، یہ دعا و التجا، اور یہ توبہ و استغفار بھی مومن صادق کی ایک ضروری علامت - اور نمایاں پہچان ہے۔ قرآن نے جس بات کا ان لفظوں میں اجمالی ذکر کیا ہے اسی کی تفصیلات ہیں جو آپ کو احادیث کے اندر ملتی ہیں، اور جن سے نبیؐ اور اصحاب نبی کی مثالی زندگی مزین نظر آتی ہے۔

اذکار عامہ کی حقیقی نوعیت

یہ اذکار اپنی روح کے اعتبار سے نماز سے کچھ الگ اور بے تعلق چیزیں نہیں ہیں، بلکہ نماز سے ان کا گہرا تعلق ہے، اتنا گہرا تعلق کہ اگر ظاہری اعمال کو بیچ سے ہٹا دیا جائے اور نظر صرف اصلی جوہر پر رکھی جائے تو دونوں کو دو کہنا ممکن ہی نہیں۔ نماز کی حقیقت کیا ہے؟ صرف اللہ کی یاد اور اس کی صفات اور لوازم صفات کا تذکرہ، جیسا کہ پچھلی بحثوں میں دلائل کے ساتھ بتایا جا چکا ہے۔ پھر نماز اور عام اذکار میں کیا فرق رہا، سوائے اس کے کہ ایک کے ساتھ کچھ خاص حرکتیں اور ہیئتیں بھی وابستہ ہیں، دوسرے میں نہیں، نماز اپنا ایک موزوں لباس رکھتی ہے، ذکر اس لباس سے عاری ہوتا ہے۔ گویا دونوں میں فرق صرف یہ ہے کہ نماز ذکر الٰہی کی مکمل ترین، موزوں ترین اور موثر ترین شکل ہے۔ جب کہ دوسرے اذکار میں یہ تکمیلی شان نہیں۔ اور یہی وجہ ہے کہ نماز اصل ذکر ہے اور دوسرے

اذکار کی حیثیت فرع اور تتمّے کی ہے۔ یہ اذکار دراصل نماز ہی کے معاون اور اسی کے مقصد کے خادم ہیں۔ اگر نماز امراضِ قلب کا اصلی اور بنیادی نسخۂ شفا ہے تو ان اذکار کو اس کی امدادی خوراکیں سمجھنا چاہیے۔ نماز کا مقصود یہ ہے کہ انسان اپنے احساسِ بندگی پر غفلت کے پردے نہ پڑنے دے، اور ہمہ وقت اللہ تعالیٰ کو یاد رکھے۔ اسی ہمہ وقتی یاد کی خاطر طلوعِ فجر سے لے کر، جب کہ انسان بیدار ہوتا ہے، ابتدائے شب تک، جب کہ وہ نظامِ قدرت کے مطابق سو جانے کے لیے آمادہ ہوتا ہے، بیداری اور حرکتِ عمل کی ساری گھڑیوں کو نمازوں سے گھیر دیا گیا ہے، اور تھوڑے تھوڑے وقفہ کے بعد اس کو کاروبارِ دُنیا سے الگ ہو کر مسجد میں آجانے اور ذکرِ الٰہی میں مشغول ہونے کا حکم دیا گیا ہے، تاکہ بار بار اس کے منصبِ عبودیت کی یاد دہانی ہوتی رہے۔ اب جو اس کے ساتھ یہ تلقین بھی فرمائی گئی کہ ہر فرض نماز کے بعد اتنی نفلیں اور ادا کیا کرو، اتنی تسبیحیں، اور اتنی تحمیدیں اور اتنی تکبیریں بھی پڑھا کرو، مسجد میں داخل ہو تو اپنے لیے فتحِ بابِ رحمت کی اور اس سے نکلو تو حصولِ فضل کی دعائیں مانگو، پھر جو کام بھی شروع کرو اللہ کا پاک نام لے کر شروع کرو، ہر بھلائی پر کلمۂ شکر اور ہر مصیبت پر کلمۂ صبر کہو، پانی پینے کے بعد، کھانے سے فارغ ہو کر، چھینک آنے پر، سوتے وقت، بیدار ہو کر، حتیٰ کہ بیت الخلاء میں جاتے ہوئے اور وہاں سے نکلتے ہوئے اس اس طرح اللہ کا نام لیا کرو، غرض زندگی کے

مختلف مواقع پر جو مختلف دعاؤں اور تسبیحوں کے پڑھنے کی زبان رسالت نے ہدایت فرمائی ہے تو ان کا مقصد صرف یہی ہے کہ نماز کی پیدا کی ہوئی یادِ خدا دم بدم تازہ ہوتی رہے، مبادا کہ مشاغل دنیوی کے ہنگاموں میں وہ ماند پڑ جائے۔ لیکن اس غیر معمولی اہتمام کے بعد بھی اگر غفلت اپنے تاریک سائے صفحۂ قلب پر ڈال دینے میں کامیاب ہو جاتی ہے تو اس کے ازالے کے لیے رات کی خاموش ساعتوں اور اشکِ ندامت کے گرم دھاروں سے کام لینے کی ترغیب دی گئی ہے۔ ان ساعتوں میں صرف یہی خصوصیت نہیں کہ وہ خاموش، سکون پرور اور اثر آفرین ہوتی ہیں، بلکہ ان میں رحمتِ الٰہی خود اپنی مغفرت کے تحفے بخشنے کے لیے گنہ گاروں کو پکار رہی ہوتی ہے[1]

عقل باور نہیں کرتی کہ ذکرِ الٰہی کے دوام کا اس سے زیادہ فطری اور مؤثر طریقہ کوئی اور بھی ہو سکتا ہے۔ اور اس فطری اور کلّی نسخہ کے صحیح استعمال کے بعد بھی روحِ انسانی غفلت زدہ باقی رہ سکتی ہے۔ پھر اسی طرح یہ بات بھی ناقابلِ تصور ہے کہ اس کلّی نسخہ کے کلّی استعمال کے بغیر بھی اساسِ دین کی صحیح، متوازن، اطمینان بخش اور ٹھوس تعمیر ہو سکتی ہے۔

---

[1] مشہور حدیث ہے کہ جب دو تہائی رات گذر چکتی ہے تو اللہ تعالیٰ نچلے آسمان پر نزول فرماتا ہے اور پکارتا ہے کہ ہے کوئی جو مجھے پکارے تو میں اس کی پکار کا جواب دوں؟ الخ
(بخاری، مسلم)

ذکر میں فکر کی شرط

لیکن یاد رہے کہ کسی شے کو اگر اس کے ضروری آداب اور بنیادی شرائط سے تہی دامن کر دیا جائے تو چاہے اس کا نام نہ بدل سکے، مگر اس شے کے نوعی فوائد اور اثرات کی توقع ہرگز نہیں کی جا سکتی۔ ایک جاندار کے جسم کا رشتہ جب تک روح سے باقی ہے، اس کے ہاتھ پاؤں سے آپ ہر اس حرکت اور عمل کی امید کر سکتے ہیں جس کا اس قسم کے جاندار سے بالعموم ظہور ہوا کرتا ہے۔ مگر کیا اس رشتے کے ٹوٹ جانے کے بعد بھی ایسی کوئی اُمید کی جا سکتی ہے؟ ظاہر ہے کہ نہیں۔ ٹھیک یہی حال اذکار، اوراد اور تسبیحات کا ہے۔ احادیث میں ان کے فضائل پڑھ کر انسان ایک مرعوب کن حیرت میں پڑ جاتا ہے۔ ایک ایک کلمۂ تسبیح کی بابت مخبر صادق علیہ الصلوٰۃ والتسلیم نے خبر دی ہے کہ اس کے انوار و برکات سے فضائے آسمانی معمور ہو جاتی ہے۔ لیکن کیا گردشِ زبان سے ادا کیا ہوا اور دانۂ تسبیح پر پڑھا ہوا ہر کلمہ اس تاثیر کا حامل ہو سکتا ہے؟ سوال نری عقیدت کا نہیں، بلکہ حقیقت کا ہے۔ صاف بات ہے کہ یہ پاک کلمات ہر آئینہ ان فیوض روحانی کا سرچشمہ نہیں ہو سکتے، بلکہ ان کا یہ اثر اسی وقت ہو سکتا ہے جب یہ دل کی گہرائیوں سے اس حال میں نکلے ہوں کہ شعور پر ان کے معانی چھائے ہوئے ہوں۔ اس لیے اگر ان اذکار کا مقصود حاصل کرنا ہو تو ضروری ہے کہ جس وقت زبان سبحان اللہ کہے، اس وقت چشم تصور کے

سامنے اللہ تعالیٰ کی وہ شان پاکی وکبریائی مجسم ہو جو اس کلمہ کے اندر پوشیدہ ہے، اس وقت ذہن میں نہ صرف اس کلمے کا ایک سادہ مطلب ہی ابھر جائے بلکہ اس کی حقیقت اور اس حقیقت کے دوررس تقاضوں کی صدا سے بھی وہ گونج اُٹھے۔ اس طور پر ادا ہونے والے ایک ایک کلمۂ تسبیح سے اگر فضائے عالم معمورِ تجلی ہو جائے تو یہ کوئی حیرت کی بات نہیں، اور اس طرح کے ایک ایک کلمۂ پُرسوز کو لینے کے لیے اگر ملائکہ باہم مسابقت کریں[1] تو انہیں ایسا کرنا ہی چاہیے۔ لیکن اگر یہ طرزِ ذکر نہ اختیار کیا جائے، اور فکر و تاثرِ معنوی سے بے نیاز ہو کر بس سبحہ گردانی ہی پر اکتفا کر لی جائے تو اس سے آپ اس فائدے کی توقع ہرگز نہ کریں، اور اگر کریں گے تو در اصل اپنے آپ کو فریب دیں گے۔ پس ذکر میں بھی فکر اور تدبر کی اتنی ہی ضرورت ہے جتنی کہ نماز میں ہے، بالخصوص قرأت کے وقت آیاتِ قرآن پر۔ بغیر فکر و تدبر کے ذکر اور نماز کی مثال اس کارتوس کی سی ہے جسے ہاتھ سے پھینک مارا جائے۔ سب جانتے ہیں کہ کارتوس کی اصلی صلاحیتیں اور تاثیریں عملاً اسی وقت ظہور میں آتی ہیں جب

---

[1] یہ اشارہ بخاری شریف کی اس حدیث کی طرف ہے جسے رفاعہ بن رافع رضی اللہ عنہ نے روایت کیا ہے اور جس میں مذکور ہے کہ ایک صحابی نے رکوع سے اُٹھتے ہوئے باوازِ بلند ربنا لک الحمد حمداً کثیراً طیباً مبارکاً فیہ، پڑھا۔ نماز ختم ہونے کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "اس کے لینے کے لیے ملائکہ نے باہم مسابقت کی۔"

اسے بندوق کی نال میں رکھ کر چلایا جائے۔ اگر کوئی نادان اس کا غلط استعمال کر کے مطلوبہ نتائج حاصل نہیں کرتا تو یہ اس کا اپنا قصور ہے، کارتوس کا نہیں، اور اسے اپنے طرزِ استعمال کی اصلاح کرنی چاہیے نہ کہ کارتوس کی صلاحیتِ کار پر بدگمانی۔ یہی حال ذکرِ الٰہی کا بھی ہے۔ اس ذکر کے الفاظ سے نہیں، بلکہ ان الفاظ کے معانی سے وہ نتائج حاصل کیے جا سکتے ہیں جو مقصود ہیں۔ یہ معانی جس حد تک اپنا عکس قلب پر ڈالیں گے اسی حد تک اس میں ایمانی زندگی پیدا ہوگی، اور اس انعکاس کا تمام تر انحصار ذہن کی یکسوئی، دل کی توجہ، فکر اور تدبّر پر ہے۔

جن لوگوں کی نظر قرآن پر ہوگی، ان سے یہ حقیقت پوشیدہ نہیں کہ اصل ذکر زبان کا ذکر نہیں بلکہ دل کا ذکر ہے۔ حقیقی ذاکر وہ ہے جو ہر وقت اللہ کو اپنے سامنے یا کم از کم یہ کہ اپنے کو اللہ کے سامنے موجود اور حاضر محسوس کرتا رہے، اس کے اعضائے جسم دنیا کے دھندوں میں مشغول ہوں مگر دل کسی اور ہی کی یاد میں اٹکا ہوا ہو اور اس کی چشمِ رضا کے اشاروں سے غافل نہ ہو۔ سورۂ جمعہ کی مشہور آیت ہے:-

فَاِذَا قُضِيَتِ الصَّلٰوةُ	جب نماز پوری ہو جائے تو زمین میں پھیل
فَانْتَشِرُوْا فِى الْاَرْضِ	جاؤ، اور اللہ کے فضل (یعنی رزق) میں
وَابْتَغُوْا مِنْ فَضْلِ اللّٰهِ	سے (اپنا حصہ) تلاش کرو اور اللہ کو

وَاذْكُرُوا اللهَ كَثِيرًا لَّعَلَّكُمْ تُفْلِحُونَ — کثرت سے یاد کرتے رہو تاکہ کامیاب ہو۔

یہ آیت حقیقی ذکر الٰہی کی سب سے بڑی شارح ہے۔ اس نے جس طرح تلاش رزق کے ساتھ ذکر الٰہی کو جوڑا ہے، وہ ایک بڑی اہم حقیقت دینی کا پتہ دیتا ہے۔ وہ گویا اس امر کی بیّن شہادت ہے کہ اصلی ذکر نام ہے کاروبار دنیا انجام دیتے ہوئے خدا سے، اس کے احکام سے، اس کی حدود سے اور اس کے محاسبے سے بے فکر نہ ہونے کا۔ خود نماز کا، جو ذکر کی کامل ترین صورت ہے، یہی مدعا ہے، اور ایک مومن کی شان بھی یہی ہے کہ وہ کسی حال اور کسی وقت میں بھی خدا سے غافل نہیں ہوتا (يَذْكُرُونَ اللهَ قِيَامًا وَّقُعُودًا وَّ عَلٰى جُنُوبِهِمْ)، نماز اور دوسرے اذکار در اصل اسی حقیقی ذکر کے وجود اور بقا کا ذریعہ ہیں۔ اس ذریعہ کی ضرورت میں ہرگز کوئی کلام نہیں، جس طرح کوئی جان، جسم کے بغیر حرکت و عمل سے قاصر ہوتی ہے، اور اس سے کسی کارنامے کے وجود میں آنے کے لیے جسم کا وجود شرط ہے، ٹھیک اسی طرح انسان کے دل کا ذاکر بننا نماز پر، اور اس کے بعد دوسرے مسنون اذکار پر بہر نوع موقوف ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی اس امر واقعی میں بھی کوئی کلام نہیں کہ ذریعہ کبھی اصل مقصود کا قائم مقام نہیں بنتا، اس لیے اگر ذکر اور نماز کی صورت اپنی اصل روح سے خالی ہو تو وہ ہرگز بھروسے کی چیز نہیں۔ اللہ تعالیٰ کا

اصلی ذکر یہ ہے کہ آدمی کے دل میں اس کی یاد بالکل فطری طور پر پیوست ہو جائے، بلکہ اس کی فطرت بن جائے، اور خواہ اس کی زبان خاموش ہو بلکہ کسی اور ہی کے ذکر میں مشغول ہو مگر اس کے دل میں یادِ الٰہی کی صدائیں گونج رہی ہوں۔ انسان کا اپنے ماں باپ اور بیوی بچوں کے ساتھ جو گہرا تعلق خاطر ہوتا ہے اس کا ذکر وہ شاذ و نادر ہی کرتا ہے، مگر اس کا دل اس ذکر سے کبھی خالی نہیں ہوتا۔ اللہ تعالیٰ چاہتا ہے کہ اس کی یاد کو اسی طرح اپنی فطری یادداشت کا جزو بنالیا جائے، ایسا جزو جو جزوِ اکبر ہو۔ اور ذکرِ الٰہی کی یہ کیفیت اس وقت تک حاصل ہونی محال ہے جب تک نماز میں تدبّر اور ذکر میں تفکّر سے کام نہ لیا جائے۔

اس حقیقت کو ذہن میں یہاں ایک بار پھر تازہ کیجیے کہ اصل شے نماز ہے، اور وہی ذکر اللہ کا اصل طریقہ اور تزکیۂ باطن کا بنیادی وسیلہ ہے۔ دوسرے اذکار کی حیثیت بالکل ضمنی ہے، اور عمل نماز کی محض مددگار تدابیر کی سی۔ اس لیے مددگار اور ضمنی تدابیر نہ تو اصل تدبیر کی کسی طرح قائم مقام ہو سکتی ہیں نہ اس کی کسی بڑی کمی کا بدل ہو سکتی ہیں، اور ان کا مطلوبہ فائدہ اسی وقت حاصل ہو سکتا ہے جب نماز کو اس کے ضروری آداب و شرائط کے ساتھ ادا کیا جا رہا ہو، جسے قرآن کی بولی میں محافظتِ صلوٰۃ اور اقامتِ صلوٰۃ کہتے ہیں۔ اس حقیقت کو بار بار نمایاں کرنے کی ضرورت یوں پیش آتی ہے کہ لوگوں کا رویّہ اس باب میں بہت غلط ہو گیا ہے اور ذکرِ اساسی (نماز) اور اذکارِ ضمنی میں مراتب شناسی کا فقدان سا نظر آتا ہے۔

غیر مسنون اذکار و اشغال

غالباً یہ اسی مراتب شناسی کے فقدان ہی کا نتیجہ ہے کہ اذکار مسنونہ ہی کو کافی نہیں سمجھا گیا اور بکثرت ایسے ذکر، اور ذکر کے مخصوص طریقے ایجاد اور اختیار کر لینے کی ضرورت محسوس کی گئی، جن کا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات میں کوئی سراغ نہیں ملتا یہ صحیح ہے کہ محتاط زبانوں نے ان چیزوں کو پاس شریعت میں جزو شریعت اور شرط تزکیہ نہیں کہا، لیکن ایسا کہنا دشوار ہے کہ زبان عمل سے بھی ان کو ایسا ہی کہا جاتا ہے، اور ذوق دینی پر ان کے زور عقیدت کی گرفت اتنی مضبوط نہیں ہے جتنی کہ مسنون اذکار و اعمال کی۔ اندازہ تو یہ کہتا ہے کہ تزکیۂ نفس کو —— جس کی بنیادی تدابیر کو ہم اساس دین کی تعبیر کہتے ہیں —— ان ہی چیزوں پر منحصر باور کر لیا گیا ہے۔ حالانکہ اگر ایسا ہوتا تو زبان رسالت خاموش نہ رہتی، جس کا کار منصبی اگر کچھ تھا تو یہی تعلیم کتاب و حکمت اور یہی تزکیۂ نفس تھا، اور جس کے لیے حرام تھا کہ شارع حقیقی کی طرف سے آیا ہوا ایک لفظ کیا معنی ایک اشارہ بھی چھپا رکھے (فَإِنْ لَّمْ تَفْعَلْ فَمَا بَلَّغْتَ رِسَالَتَهُ) اور پھر لفظ اور اشارہ بھی ایسا، جس کے اوپر تزکیۂ نفس کا دارومدار ہو، یا کم از کم یہ کہ اس کے باب میں شرط تکمیل ہو۔

انکار اس بات کا نہیں کہ ان اذکار و اشغال میں تاثیر ہے، بلاشبہ تاثیر ہے، اور بڑی دلنواز تاثیر ہے۔ ہم ان بزرگوں کو کیسے جھٹلا دیں جنہوں نے اس کے تجربے کیے ہیں۔ مگر سوال یہ ہے کہ کیا ہر وہ شے جو دلوں پر اثر ڈالنے والی

ہو، وہ بہرحال اختیار بھی کی جاسکتی ہے؟ کتنی ہی چیزیں ایسی ہوتی ہیں جن کے فوائد بہت جلد سامنے آجاتے ہیں، لیکن بعد میں چل کر ان کے مضرات ان فوائد سے بھی بڑھ جاتے ہیں، کتنے ہی مشاغل افراد کی انفرادی مصلحتوں کے حق میں ہوتے ہیں اور انہیں بہت مفید ثابت ہوتے ہیں، لیکن دین وملت کی مجموعی مصلحتوں کو ان سے نقصان ہی پہنچتا ہے۔ اس لیے تجربتاً کسی بات کا فی نفسہٖ پُرتاثیر اور مفید مطلب ثابت ہونا اس امر کی کافی وجہ جواز نہیں کہ اسے قبول ہی کر لیا جائے، اور قبول بھی اس طرز پر کہ عملاً دین کے خاکے میں اس کا رنگ سب سے زیادہ گہرا اور اُبھرا ہوا ہو۔ نصاریٰ نے رہبانیت اختیار کر لی تھی، کیونکہ ان کے خیال میں وہ وصول الی اللہ کا مؤثر ترین نسخہ تھی، نیز ان کے تجربے نے بھی اس کی تصدیق کر دی تھی اس کی اس غیر معمولی تاثیر کا اعتراف قرآن مجید نے بھی کیا ہے چنانچہ وہ سچے راہبوں کے متعلق فرماتا ہے کہ:۔

وَلَتَجِدَنَّ أَقْرَبَهُمْ مَوَدَّةً لِّلَّذِينَ آمَنُوا الَّذِينَ قَالُوا إِنَّا نَصَارَىٰ ذَٰلِكَ بِأَنَّ مِنْهُمْ قِسِّيسِينَ وَرُهْبَانًا وَأَنَّهُمْ لَا يَسْتَكْبِرُونَ وَإِذَا سَمِعُوا مَا أُنزِلَ إِلَى

مومنوں سے محبت کرنے میں سب سے آگے تم ان لوگوں کو پاؤ گے جو کہتے ہیں کہ ہم نصاریٰ ہیں۔ یہ اس لیے کہ ان میں قسیس اور راہب ہیں اور اس لیے کہ ان میں کبر وخود پرستی نہیں ہے۔ چنانچہ جب یہ لوگ اس کلام کو سنتے ہیں جو اللہ کے رسول پر نازل ہوا ہے تو تم

الرَّسُوْلِ تَرٰۤی اَعْیُنَھُمْ تَفِیْضُ مِنَ الدَّمْعِ مِمَّا عَرَفُوْا مِنَ الْحَقِّ الخ (مائدہ)

دیکھتے ہو کہ حق کی معرفت سے ان کی آنکھیں اشک ریز ہو جاتی ہیں۔

خط کشیدہ لفظوں پر پلٹ کر پھر غور کریجیے، ان لوگوں کے اندر (دعوتِ اسلام اور حاملین قرآن سے جو محبت، ان کے قلب میں جو گداز، باطن میں جو خشوع اور روح میں قبولِ حق کی جو تڑپ موجود پائی گئی وہ کس چیز کا فیضان تھی؟ اس بات کا کہ "ان میں قسیس اور راہب ہیں" بالفاظِ دگر وہ فیضان تھی رہبانیت کا لیکن اس کے باوجود اسی رہبانیت کے بارے میں یہی قرآن یہ بھی فرماتا ہے کہ:۔

وَرَهْبَانِيَّةَ نِ ابْتَدَعُوْهَا مَا كَتَبْنٰهَا عَلَيْهِمْ اِلَّا ابْتِغَآءَ رِضْوَانِ اللّٰهِ فَمَا رَعَوْهَا حَقَّ رِعَايَتِهَا (سورہ حدید)

اور رہبانیت کو انہوں نے از خود گھڑ لیا ہے۔ ہم نے ان پر اسے عائد نہیں کیا تھا ـــ ہم نے ان پر جو کچھ عائد کیا تھا وہ صرف یہ تھا کہ اللہ کی رضا چاہیں ـــ لیکن انجام کار وہ اس رہبانیت کا حق ادا نہ کر سکے۔

اس آیت کے تین ٹکڑے ہیں، اور ہر ایک دینی حکم و مصالح کا ایک مستقل باب ہے:۔

(۱) پہلے ٹکڑے میں اس بات کا اعلان ہے کہ رہبانیت کوئی مامور بہٖ شے

نہیں بلکہ ایک "مُبتَدَع" چیز ہے، اللہ تعالیٰ کی ہدایات منزلہ سے اس کا کوئی تعلق نہیں، اس لئے ہرگز ہرگز اس کی تلقین نہیں فرمائی تھی، یہ تو ان نصاریٰ کی اپنی "ابتداع" اور اختراع ہے۔

جی ہاں! یہ اسی رہبانیت کے متعلق اللہ جل مجدہ کا تبصرہ ہے جس کو ابھی ابھی اسی کی بارگاہ سے مذکورہ سند تحسین بھی مل چکی ہے۔ بظاہر ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ان دونوں باتوں میں تضاد ہے، مگر ہمیں معلوم ہے کہ قرآن تضاد بیانی سے پاک ہے۔ پس اگر آپ دیدہ ریزی سے کام لیں تو پائیں گے کہ یہ دونوں باتیں جو بالکل الگ امور سے متعلق ہیں پہلی آیت میں جس چیز کا اعتراف ہے وہ یہ چیز ہے کہ رہبانیت قلب انسانی میں نرمی، خشوع، خدا ترسی اور حق پرستی پیدا کرتی ہے، اور دوسری آیت کے زیر بحث ٹکڑے میں اس بات کا اظہار ہے کہ نصاریٰ نے اسے اختیار کر کے غلطی کی اور (باوجود اس قوت تاثیر اور اپنی اس مجرب افادیت کے) اللہ تعالیٰ کی نازل کی ہوئی شریعت سے اس کا کوئی تعلق نہیں، اس لئے ہرگز ہرگز یہ راہ انہیں نہیں بتائی تھی، یہ ان کی اپنی گھڑی ہوئی چیز ہے، ان کے ذوق اور اجتہاد کی تخلیق ہے، اور یہ بات ایک ایسی بات ہے جو نہیں ہونی چاہیے تھی۔ مانا کہ رہبانیت کے اندر انہوں نے بڑی برکات کا مشاہدہ کیا مگر انہیں جب اس کی ہدایت نہیں کی گئی تھی تو کسی حکمت اور برتر مصلحت ہی کی بنا پر نہیں کی گئی تھی۔ اس لیے اسے اختیار نہیں کرنا چاہیے تھا۔

(۲) دوسرے ٹکڑے میں اس حقیقت کا اظہار ہے کہ تمام دوسری شریعتوں کی طرح شریعت عیسوی میں بھی بندوں سے صرف "ابتغاء رضوان اللہ" کا مطالبہ تھا، اس سے زائد کوئی چیز ان سے نہیں چاہی گئی تھی۔ گویا مطلب یہ ہوا کہ رہبانیت اپنی تمام تر اثرانگیزیوں اور ایمان افروزیوں کے باوجود اصل مطالبۂ شریعت کے عین مطابق نہ تھی، اس کو دین خداوندی کا عین منشاء قرار نہیں دیا جا سکتا، بلکہ وہ اس سے بہت کچھ مختلف چیز تھی۔ اللہ کا دین تو انسان سے صرف یہ چاہتا ہے کہ اس کی مرضیات کی پیروی کی جائے، اور مرضیات کی پیروی اس چیز کا نام نہیں ہے کہ آدمی بطور خود اپنے ذوق اور اجتہاد سے ایک نصب العین متعین کرلے۔ اور پھر اس نصب العین تک پہنچنے کے لیے اسی اپنے ذوق اور اجتہاد سے ایک راہ مقرر کرکے اس پر چلنا شروع کردے، بلکہ مرضیات رب کی پیروی نام ہے اس کے جمیع احکام شریعت کی بجاآوری کا، ایسی بجاآوری کا جس میں بندے نے اپنے ذوقِ ترک و اختیار کو ذرہ برابر دخل نہ دیا ہو۔

(۳) تیسرے ٹکڑے میں اس حکمت کا افشا ہے جس کی بنا پر "رہبانیت" اور "ابتغاء رضوان اللہ" میں فرق رکھا گیا ہے، اور ان دونوں چیزوں کو ہم معنی نہیں ٹھیرایا گیا، حالانکہ نصرانی بزرگان دین نے اپنی نیت کے پورے اخلاص کے ساتھ ایسا ہی سمجھ رکھا تھا، بلکہ ان کے خیال میں رہبانیت ہی کمال دین

تھی فرمایا جاتا ہے کہ "عام فطرت انسانی جس معتدل راہ پر چل سکتی ہے رہبانیت اس سے دشوار تر ہے۔ نوع انسانی کا عمومی مزاج اسے اپنے لیے ایک بار سمجھتا ہے۔ خلاق عالم نے جس نوع کو بھی پیدا کیا ہے اس کو ٹھیک وہی فطرت عطا فرمائی ہے جو اس کے مقصود آفرینش کے لیے مناسب تھی۔ رہبانیت اگر فطرت انسانی سے مختلف مزاج رکھتی ہے، جیسا کہ واقعہ ہے، تو اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ جس مقام تک اس کو پہنچاتی ہے اس مقام کا پہنچنا انسان کا مقصود آفرینش ہے ہی نہیں، یہ اور بات ہے کہ تم کو وہ مرغوب ہو اور تم اس کو اپنی ترقی کا کمال سمجھ لو۔ مگر سوچنے کا یہ انداز ہی سراسر غلط ہے۔ تمہیں دیکھنا تو یہ چاہیے کہ تم پیدا کس کام کے لیے کیے گئے ہو، نہ کہ تمہاری دانست میں مقام کمال کیا ہے۔ اور یہ بھی دراصل نظر کا فریب ہے، ورنہ ہر نوع کی طرح نوع انسان کا بھی مقام کمال صرف اسی فرض کی انجام دہی ہے جس کے لیے وہ معرض وجود میں لائی گئی ہے۔ پھر اس فرض کی تعیین اللہ تعالےٰ ہی کے کرنے کی چیز ہے اور اس کی بجا آوری کا ڈھنگ بھی وہی بتانے والا ہے جس مالک نے تمہاری منزل مقرر فرمائی ہے وہی راہ عمل بھی مقرر کرنے والا ہے۔ رہبانیت جو راہِ عمل پیش کرتی ہے اگر وہی اللہ تعالیٰ کے نزدیک تسلیم شدہ ہوتی تو یقیناً وہ اسی کے مناسب انسان کی فطرت بھی پیدا کرتا جو موجودہ فطرت سے بہت کچھ مختلف ہوتی اور اسی کے سامنے یہ منزل مقصود

بھی رکھتا۔ لیکن جب اس نے ایسا نہیں کیا تو تمہیں سمجھ لینا چاہیے تھا کہ رہبانیت کا راستہ اور اس کی منزل خواہ بہت بہتر ہی کیوں نہ ہو۔ مگر وہ اختیار کرنے کی چیز نہیں۔ رہبانیت کا مقصود ہے "وصول الی اللہ" اور اللہ تعالیٰ نے انسان کو پیدا کیا ہے "ابتغاء مرضات اللہ" کے لیے۔ لاریب "وصول الی اللہ" کی عظمت و مرتبت بجائے خود ماورائے تصور ہے، مگر کسی شے کے اختیار کر لینے کے لیے صرف یہی کافی نہیں کہ وہ بلند مرتبت ہی بلکہ اس کے لیے اس کی توثیق بھی ضروری ہے جس کی خاطر وہ اختیار کی جا رہی ہے۔ اس میں نہ صرف یہ کہ اللہ جل مجدہ کے مقرر کیے ہوئے نصب العین سے بلند نصب العین اختیار کر لینے کی غلطی کا ارتکاب ہے بلکہ اپنے حق میں مختلف خطرات کا خرید لینا ہے، اپنی فطرت پر زائد بوجھ لاد لینا ہے، جس کے اٹھانے کے لیے تمہیں غیر معمولی مشقتیں اٹھانی اور مصنوعی ترکیبیں اختیار کرنی پڑیں گی جس کا نتیجہ صرف یہ ہوگا کہ آدم و بنی آدم کی آفرینش کی جو ایک مخصوص غایت تھی اس کا سارا کاروبار درہم برہم ہو کر رہ جائے گا بلکہ خود تم آج نہیں تو کل تھک ہار کر بیٹھ جاؤ گے یعنی تم میں سے چند ایک اپنی غیر معمولی کوششوں کے ذریعہ اگر اس راہ میں کامیاب بھی ہو گئے تو یقین جانو ہزاروں اور لاکھوں ہنس کی یہ چال چل کر خود اپنی چال بھول جائیں گے" —— چنانچہ نصاریٰ کی دینی تاریخ پکار پکار کر کہہ رہی ہے کہ فَمَا رَعَوْهَا حَقَّ رِعَايَتِهَا۔

جس رہبانیت نے ان کے اندر تھوڑے بہت سراپا تقدس رہبان پیدا کیے اسی نے ملتِ عیسوی کو شر و بدعت کا، حرام خوری اور حرام کاری کا، دین فروشی اور طاغوت نوازی کا گہوارہ بنا کر رکھ دیا۔

مختصر یہ کہ قرآن حکیم نے رہبانیت کو شرک نہیں کہا، کفر نہیں کہا، واقعی ضلالت اور گمراہی نہیں ٹھیرایا، بلکہ اس کے پیدا کردہ نتائج کی تحسین تک فرمائی، مگر بایں ہمہ اس کو یہ بات ناپسند ہے کہ اسے اختیار کر لیا گیا۔ اس کے صاف معنی یہ ہیں کہ اگر دیگر خداوندی حکمتوں اور شرعی مصلحتوں کو نظر انداز کر کے دیکھا جائے تو رہبانیت کوئی مذموم اور باطل شے نہیں، نہ ہی اللہ تعالیٰ نے اس کے حق میں اشارۃً کنایۃً بھی اس قسم کی کوئی بات کہی ہے، مگر چونکہ عام دینی حکم و مصالح کے پیش نظر وہ اختیار کرنے کی چیز نہیں اس لیے اس بات کو وہ پسند نہیں کرتا کہ نصاریٰ نے اسے اپنا لیا۔ اس نے سچے اور مخلص راہبوں کی تعریف بھی کی، ان کو گمراہ اور بے دین نہیں ٹھیرایا، لیکن ان مخلص اور نیک نیت بزرگوں کے اختیارِ رہبانیت پر نرم لب و لہجہ میں سہی مگر مذمت بھی ضرور کی کیونکہ یہ دین میں غلو اور تشددؔ تھا جو بالآخر دین کے مزاج کو محرف اور ابتر بنا دیا کرتا ہے۔

اور اگرچہ جن نیک نفس عیسائیوں نے رہبانیت کا نسخہ ایجاد کیا تھا انہوں

لے۔ یاد رہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے رہبانیت کو تشدد پسندی قرار دیا ہے (مشکوٰۃ)

نے انتہائی شوقِ بندگی ہی میں ایسا کیا تھا، جیسا کہ خود رہبانیت کا لفظ بھی بتاتا[1] ہے۔ مگر معبودِ حقیقی نے اس شوقِ بندگی کو اچھی نظروں سے ہرگز نہیں دیکھا، کیونکہ یہ چیز مجموعی طور پر دین وملّت کے حق میں مفید ثابت نہیں ہوئی اور اس غلو وتشدّد کے بھاری تقاضوں کو اگر دو چار نفوسِ زکیہ نے پورا کیا تو ہزاروں نے ان کی مٹی پلید کر کے رکھ دی۔ اس طرح بحیثیت مجموعی ملّت کا دینی مزاج ابتر، غیر متوازن اور غیر فطری ہو کر رہ گیا۔ ان کے سامنے سے وہ مقصدِ اصلی اوجھل ہو گیا جس کے لیے وہ اور ساری نوعِ انسانی پیدا کی گئی ہے۔ اگر یہ دور رس غیر محمود نتائج اس مقدس رہبانیت کے بطن میں پوشیدہ نہ ہوتے تو عالم الغیب کی نگاہوں سے وہ مخفی نہ تھی، وہ خود ہی اپنی کتابِ ہدایت میں آیاتِ محکمات کے ذریعہ اس کی تلقین فرما دیتا اور اپنی "شفاء للمؤمنین" شریعت میں اس نسخہ رہبانیت کو ضرور درج کر دیتا، اسے لوگوں کی تجرباتی کاوشوں کے لیے نہ اٹھا رکھتا۔ درانحالیکہ اس نے جو کتاب بھی بھیجی وہ "مفصل" تھی اور جس مقصد کے لیے وہ بھیجی گئی تھی اس کے ایک ایک جزیے تک کو واضح طور پر بیان کر دینے

---

[1] رہبانیت "رہب" سے مشتق ہے جس کے معنی پُر اضطراب خوف کے ہیں۔ اور خود اصطلاحِ رہبانیت کا مطلب ہے غلوّ فی تحمّل التعبد من فرط الرھبۃ (شدتِ خوف کی بنا پر خدا پرستی میں غلو اختیار کرنا) مفردات امام راغب۔

دالی تھی، پھر حیرت ہے اگر اس کی بھیجی ہوئی کسی کتاب و شریعت میں وہی بات ذکر ہونے سے رہ جائے جس پر کمال بندگی کا انحصار ہو۔

مسئلہ رہبانیت کے یہ دو گونہ رخ ہمارے سامنے ہیں، اور ہمیں یہ حقیقت سمجھا دینے کے لیے بالکل کافی ہیں کہ دین و شریعت کے باب میں کسی شے کا بذات خود پُر تاثیر ہونا اس کے قابلِ قبول ہونے کے لیے ہرگز کافی نہیں، بلکہ اس کے لیے اللہ اور اس کے رسول کی تشخیص و تائید بھی ضروری ہے۔ اس لیے ایسے اذکار و اشغال احتیاط کے قابل ہیں جن کے ذکر سے رسولؐ کی تعلیمات خاموش ہیں۔ کیونکہ اس خاموشی کا مطلب اس کے سوا اور کچھ نہیں کہ یہ چیزیں اس مقصد کی تحصیل میں سو فیصدی مفید و موافق نہ تھیں جس کے لیے انسان پیدا کیا گیا ہے۔ بس یہی وجہ ہے کہ انہیں نظر انداز کر دیا گیا ہے، ورنہ یہ ممکن نہ تھا کہ اللہ تعالیٰ انہیں اپنی تعلیمات میں جگہ نہ دیتا، کیونکہ وہ عالم الغیب ہے، کوئی بات اس کے علم سے ہرگز پوشیدہ نہیں۔

فی الواقع ہم یہ سمجھنے سے قاصر ہیں کہ اللہ کے آخری نبی، آخری معلّم اور آخری مزکّی کے آجانے کے بعد بھی ذکر و تعبد کے کچھ گوشے مخفی رہ گئے ہوں اور وہ ہمارے تجربات و اجتہادات کے محتاج ہوں۔ فقہی اجتہادات پر ان کو قیاس کرنا قیاس مع الفارق ہے۔ فقہی مسائل میں اجتہاد کی ضرورت عقلؔ سے، اور اس کی اجازت، بلکہ حکم، نقلؔ سے بالکل واضح طور پر ثابت

رہے :-

عقلاً اس کی ضرورت اس لیے ہے کہ زمانہ کی رفتار کے ساتھ ساتھ مسائل و معاملات زندگی بھی نت نئے پیدا ہوتے رہتے ہیں، اس لیے ان میں نصوص کتاب و سنت کی بنیادوں پر قیاس کر کے اجتہاد کیے بغیر چارہ نہیں علامہ ابن رشد کے لفظوں میں "عقل قیاس و اجتہاد کی ضرورت پر شاید ہے، کیونکہ لوگوں کو پیش آنے والے معاملات غیر متناہی ہیں، اور فرمودات خدا و رسول، نیز آنحضرت کے افعال و اقرارات بہر حال متناہی ہیں، اور یہ ایک کھلی ہوئی حقیقت ہے کہ غیر متناہی اور متناہی میں برابری نہیں ہو سکتی (مقدمہ بذایۃ المجتہد)

نقلاً اس کی اجازت اور ہدایت کا حال احادیث و آثار سے پوچھیے۔ رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد، صحابہ کا اجماع، خلفائے راشدین کا اسوہ سب کے سب اجتہاد فقہی کی ضرورت و اجازت کے گواہ ہیں، حتیٰ کہ قرآن کے متعدد اشارات تک میں اس کی تائید موجود ہے۔ تفصیل کا نہ یہ موقع ہے نہ اس کی چنداں حاجت، اس لیے مثال کے طور پر صرف چند حوالے ملاحظہ ہوں۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے جب قاضی شریح کو عہدۂ قضا سپرد کیا تو انہیں ہدایت فرمائی کہ :-

ما استبان لک من — جس قضیہ کا حل تمہیں اللہ کی کتاب سے

كتاب الله فلا تسئل عنه فان لم يتبين فى كتاب الله فمن السنة فان لم تجد فى السنة فاجتهد برأيك (اعلام الموقعین جلد اوّل)

مل جائے اس کے متعلق پھر کسی اور طرف نہ رجوع کرنا، اور اگر کتاب الٰہی میں نہ ملے تو سنت سے رجوع کرنا، اور سنّت میں بھی نہ ملے تو اپنی رائے سے اجتہاد کرنا

اسی طرح حضرت عمرؓ کے ان ہدایت ناموں میں جو وہ وقتاً فوقتاً حضرت ابوموسیٰ اشعری کے نام بھیجا کرتے تھے، یہ الفاظ ملتے ہیں:-

..... ثم الفهم فيما ادلى اليك بما ورد عليك مما ليس فى القرآن ولا فى السنة ثم قايس الامور عند ذالك واعرف الامثال ثم اعمد فيما ترى احبها الى الله واشبها بالحق (ایضاً)

..... پھر ان معاملات میں، جو تمہارے سامنے لائے جائیں مگر ان کا جواب نہ تو قرآن میں ملے نہ ہی سنت میں، پورے غور وفکر سے کام لو اور ایسے وقت میں مسائل کو ایک دوسرے پر قیاس کرو (نصوص میں) مسئلہ پیش آمدہ کی مثالیں ڈھونڈھو اور پھر اس کے اس حل کو قبول کرو جو تمہاری صوابدید میں اللہ کے نزدیک پسندیدہ تر اور حق سے قریب تر نظر آئے۔

بقول علامہ ابن قیم حضرت عمرؓ نے ہزاروں صحابہ کی موجودگی میں یہ طرزِ عمل اختیار کیا مگر کسی نے بھی اس کی مخالفت نہیں کی، جو اس بات کا ثبوت ہے کہ یہ تمام صحابہ کرام کا اجماعی اور متفق علیہ مسئلہ ہے۔

نیز یہ تو آثار ہیں اور اصحاب رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا فیصلہ وعمل، خود

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا حال یہ ہے کہ حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ کو یمن کا گورنر بنا کر بھیجتے ہیں، بھیجتے وقت ان سے پوچھتے ہیں کہ "معاملات کا فیصلہ کیسے کرو گے؟" وہ جواب دیتے ہیں کہ "کتاب اللہ کے مطابق" آپ پھر استفسار فرماتے ہیں کہ "اگر کتاب اللہ میں کسی مسئلہ کا جواب نہ ملے تو کیا کرو گے؟" وہ کہتے ہیں کہ "اس وقت سنت رسول کے مطابق فیصلہ کروں گا۔" آپ تیسرا سوال کرتے ہیں "اور اگر سنت رسول بھی کوئی جواب نہ دے تب؟" وہ عرض کرتے ہیں کہ:۔

اجتهد رائی ولا آلو، (مشکوٰۃ) اپنی رائے سے اجتہاد کروں گا اور اس میں کسی قسم کی کوتاہی نہ کروں گا۔"

یہ جواب سن کر زبان رسالت سے صرف اس کی تصویب ہی نہیں ہوتی بلکہ اس پر یوں کلمات شکر جاری ہو جاتے ہیں:۔

الحمد للہ الذی وفق رسول رسول اللہ لما یرضی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

شکر ہے اس کا جس نے اپنے رسول کے فرستادے کو اس بات کی توفیق بخشی جو اس کے رسول کو پسند ہے۔

یہ ہے ظاہری اور فقہی مسائل میں اجتہاد و قیاس کی شرعی پوزیشن۔ لیکن کیا تزکیۂ نفس اور مسئلہ باطن کا معاملہ بھی ایسا ہی ہے؟ کیا اس کے لیے اجتہاد کی واقعی ضرورت ہے، اور اس ضرورت پر عقلی اور نقلی دلائل موجود ہیں؟ اس کا جواب اثبات میں دینا سخت دشوار ہے۔

عقلی پہلو سے دیکھیے تو قلوب انسانی کے بنیادی حقائق رفتارِ زمانہ کے ساتھ بدلنے والے نہیں، وہ جیسے کل تھے ویسے ہی آج بھی ہیں اور ہزار برس بعد بھی ویسے ہی رہیں گے۔ انسان کی باطنی بیماریوں میں ماضی حال اور مستقبل کا فرق کوئی جوہری فرق نہیں کیا کرتا، جو بیماریاں زمانہ رسالت میں دلوں کو بیمار بنایا کرتی تھیں وہی آج بھی انہیں لاحق ہوا کرتی ہیں۔ پس اگر تزکیہ نفس کا مدعا یہی ہے کہ نفس انسانی کو کفر، شرک، نفاق، دُنیا پرستی، غفلت، آخرت فراموشی اور اتباع خواہش کے روگوں سے پاک کرکے اللہ کا سچّا پرستار اور مخلص طاعت گزار بنا دیا جائے تو یقین کرنا چاہیے کہ عہدِ رسالت میں بھی یہ روگ اسی طرح دلوں کو لاگو ہوا کرتے تھے جس طرح کہ آج، اور جب ایسا ہے تو دوسرا یقین یہ کرنا چاہیے کہ ان روگوں کے علاج کے لیے کسی نئے نسخے کی ہرگز کوئی ضرورت نہیں، اللہ اور اس کے رسول نے جو نسخہ تجویز فرما دیا ہے وہ بالکل کافی ہے اور ہمیشہ کے لیے کافی ہے، اسی میں شفا ہے، ایسی شفا جو شفائے کلی ہے اور جو قلب و روح کو ان کی فطری تندرستی اور توانائی بخشنے والی ہے اس نسخہ میں کسی قسم کے تغیر کی واقعی ضرورت محسوس کرنا اللہ اور اس کے رسول کی محتاط اور کامل تشخیص کی ناقدرشناسی بھی ہے اور اس کی شان میں سوئے ادب بھی، بلکہ سوئے ظن بھی، اگرچہ وہ نادانستہ ہی کیوں نہ ہو۔

نقل کے پہلو سے دیکھیے تو کتاب و سنت اس اجتہاد روحانی کی اجازت

سے یکسر خاموش نظر آئیں گی، نہ صرف یہ کہ اجازت سے خاموش نظر آئیں گی بلکہ اس سے روکتی ہوئی بھی دکھائی دیں گی۔ رہبانیت اختیار کرنے پر قرآن نے نصاریٰ کے حق میں جس ناپسندیدگی کا اظہار کیا ہے اس کی زد سے خود اس کے اپنے پیروؤں کے روحانی اجتہادات بھی باہر نہیں قرار دیے جا سکتے۔ اس بنا پر نہیں کہ دونوں ایک ہی سی چیزیں ہیں، بلکہ اس اصول کی بنا پر جس کی ہم ابھی شرح کر چکے ہیں۔ قرآن کے بعد سنتؐ کا مطالعہ کیجیے تو وہاں اس طرح کی چیزیں بلکہ ممانعتیں اور وعیدیں ملتی ہیں:-

مَنْ اَحْدَثَ فِی اَمْرِنَا ھٰذَا — جس کسی نے ہمارے اس معاملہ (دین) میں
مَا لَیْسَ مِنْہُ فَھُوَ رَدٌّ (مسلم و بخاری) — کوئی نئی بات نکالی اسکی یہ بات مردود ہوگی۔

ظاہر ہے کہ معاملۂ دین کا اولین اطلاق عبادات اور اذکار و تسبیحات ہی پر ہوگا دوسرے امور کا نمبر ان کے بعد آئے گا۔

جن علمائے دین نے شب برات کے حلوے اور عیدین کی سویوں تک کو اس "احداث فی الدین" کے اندر شامل محسوس کیا ان کی دینی بصیرت اور شدت احتیاط سراہنے کے قابل ہے، مگر اس بات سے کوئی شخص بھی انکار نہیں کر سکتا کہ اس قسم کی چیزیں اس احداث کے دائرہ میں براہ راست نہیں آتی ہیں بلکہ ایک عارض کے بعد ہی آسکتی ہیں، یعنی اس وقت جب کہ انہیں کوئی آدمی حکم شرع سمجھ کر اور تقرب و ثواب کا ذریعہ جان کر پکائے کھائے ورنہ فی نفسہ

ان کے پکانے کھانے میں کوئی مضائقہ شرعی نہیں، کیونکہ پکانا کھانا امور دین نہیں، خالصاً امور دنیا ہیں، اور کوئی دنیوی کام دینی نقطۂ نگاہ سے اسی وقت قابل بحث ہوتا ہے جب اس میں کوئی اعتقادی یا اخلاقی پہلو پیدا ہو۔ لیکن کیا اشغال و اذکار، اور وہ وظائف اور فکر و مراقبات بھی اسی نوع کی چیزیں ہیں؟ کیا یہ امور بھی امور دین بالذات نہیں بلکہ بالغیر ہیں؟ کیا ان کی حیثیت اصلاً امور دنیا کی ہے اور وہ دائرہ دین سے یکسر خارج ہیں، اور اگر اس کے اندر آتے بھی ہیں تو کسی عارض کے بعد ہی آتے ہیں؟ کون ہے جو ان سوالوں کے جواب میں ہاں کہہ سکتا ہے! آنکھیں رکھنے والا اپنی آنکھیں کیسے بند کرے گا اور اپنے دل کو کیسے باور کرائے گا کہ یہ امور، دین سے تعلق نہیں رکھتے، درآں حالیکہ وہ سراپا امور دین ہیں، وہ اپنی روح اور اپنی صورت دونوں کے اعتبار سے دینی نوعیت رکھتے ہیں۔ بھلا وہ امور جو امور عبادت ہیں ان کو دین سے کون علیحدہ قرار دے سکتا ہے۔ لوگوں نے تصور دین پر انتہائی مظالم کیے ہیں۔ اس کی بڑی بے دردی سے قطع و برید کی ہے، زندگی کے اجتماعی، تمدنی، عائلی حتیٰ کہ اخلاقی مسائل تک کو ایک ایک کرکے اس کے حدود سے باہر کر دیا ہے، مگر یہ جرأت آج تک کسی کو نہیں ہو سکی ہے کہ وہ عبادات کو نماز روزے کو، اور اللہ تعالیٰ کے یاد کرنے کے طریقوں کو تصور دین سے خارج کر دے، اس کے بعد پھر دین میں رہ ہی کیا جاتا ہے، سوائے اس کے کہ وہ ایک لفظ ہو بے معنی، ایک اسم ہو بے مسمیٰ۔ الغرض

اذکار و اشغال کو امور دین سے خارج سمجھنا ممکن نہیں، وہ بالذات امور دین ہیں۔ وہ صورتاً بھی امور دین ہیں اور حقیقتاً بھی، اور دین عبادت کے سوا اور کچھ نہیں ہیں۔ پھر جب یہ عملی حقیقت بھی سامنے آجائے کہ تزکیۂ نفس اور وصول الی اللہ کے باب میں ان غیر مسنون اور اجتہادی اذکار و اشغال کو اتنا مفید و موثر مانا جاتا ہے جتنا مسنون عبادات و اذکار کو بھی نہیں مانا جاتا اور ان کا اہتمام بھی اسی تناسب سے غیر معمولی کیا جاتا ہے، تو ان امور کا دینی مقام بام ثریا سے بھی آگے جا پہنچتا ہے اور ان کی دینی و تعبدی نوعیت ہر شک و شبہے سے بالاتر ہو جاتی ہے۔ اب غور کیجیے کہ جس دین کا مزاج لطیف کھانے پینے کی پاک چیزوں کو بھی بعض عوارض کی وجہ سے برداشت کرنے کے لیے تیار نہیں وہ ان خالص دینی نوعیت رکھنے والی باتوں کو کیوں قبول کرنے لگا! اور یہ کتنی عجیب بات ہوگی کہ ان نو ایجاد باتوں پر ہم مذکورہ بالا نص شرعی کو تو منطبق کریں جن کا شامل دین ہونا بالذات نہیں بالعرض ہے، اور ان باتوں کو اس سے غیر متعلق قرار دے کر صاف بچا لے جائیں جو سو فی صدی داخل دین ہیں، جو اصلاً دین ہیں، جو بالذات عبادت ہیں۔

رہی یہ بات کہ ان امور کو بھی کتاب و سنت کے اشارات سے نکالا گیا ہے، تو گذارش یہ ہے کہ نظریۂ رہبانیت کب بالکل ہی خانہ ساز نظریہ تھا اور وہ آیات انجیل سے نہیں نکالا گیا تھا؟ جن دین دار علمائے انجیل نے

رہبانیت کو وصول الی اللہ کا کامل ترین ذریعہ قرار دیا تھا ان کے سامنے بھی انجیل ہی کی یہ آیتیں تھیں:۔

"شریر کا مقابلہ نہ کرنا جو کوئی تیرے داہنے گال پر طمانچہ مارے دوسرا بھی اس کی طرف پھیر دے۔ اور اگر کوئی نالش کر کے تیرا کرتا لینا چاہے تو چوغہ بھی اسے لے لینے دے۔ اور جو کوئی تجھے ایک کوس بیگار میں لے جائے تو اس کے ساتھ دو کوس چلا جا۔" (متی باب ۵)

"اپنے واسطے زمین پر مال جمع نہ کرو...... تم خدا اور دولت دونوں کی خدمت نہیں کر سکتے۔ اس لیے میں تم سے کہتا ہوں کہ اپنی جان کی فکر نہ کرنا کہ ہم کیا کھائیں گے اور کیا پئیں گے، اور نہ اپنے بدن کی کہ کیا پہنیں گے۔ ہوا کے پرندوں کو دیکھو الخ" (متی باب ۶)

"یسوع نے اس سے کہا، اگر تو کامل ہونا چاہتا ہے تو جا اپنا مال و اسباب بیچ کر غریبوں کو دے دے تجھے آسمان پر خزانہ ملے گا، اور آ کر میرے پیچھے ہولے .... میں تجھ سے سچ کہتا ہوں کہ دولت مند کا آسمان کی بادشاہی میں داخل ہونا مشکل ہے۔ اور پھر تم سے کہتا ہوں کہ اونٹ کا سوئی کے ناکے میں سے نکل جانا اس سے آسان ہے کہ دولت مند خدا کی بادشاہی میں داخل ہو۔" (متی باب ۲۰)

"ایک اور شاگرد نے اس سے کہا اے خداوند مجھے اجازت دے کہ

پہلے جاکر اپنے باپ کو دفن کروں۔ یسوع نے اس سے کہا، تو میرے پیچھے چل اور مردوں کو اپنے مردے دفن کرنے دے" (متی باب ۸)

پس اگر تیری دہنی آنکھ تجھے ٹھوکر کھلائے تو اسے نکال کر اپنے پاس سے پھینک دے، کیونکہ تیرے لیے بہتر ہے کہ تیرے اعضا میں سے ایک جاتا رہے اور تیرا سارا بدن جہنم میں نہ ڈالا جائے" (متی باب ۵)

"اے بیت صدا! تجھ پر افسوس! کیونکہ جو معجزے تم میں ظاہر ہوئے اگر صور اور صیدا میں ہوتے تو وہ ٹاٹ اوڑھ کر اور خاک میں بیٹھ کر کب کے توبہ کر لیتے۔" (متی باب ۱۲)

ان آیات انجیل پر نظر ڈالیے بالخصوص خط کشیدہ الفاظ پر، اور پھر فیصلہ کیجیے کہ انجیل کی یہ آیات رہبانیت کا تصور پیدا کرنے کا سامان زیادہ رکھتی ہیں یا قرآن کی وہ آیات اور وہ احادیث رسول، روحانی اجتہادات کی اجازت دینے میں زیادہ نمایاں ہیں کہ جن سے یہ اجازت نکال لی گئی ہے[1]

---

[1] ایسی آیات و احادیث جن سے تصوف کے غیر مسنون اذکار و اعمال کا استنباط کیا گیا ہے بے شمار ہیں اس لیے انہیں خوف طوالت سے یہاں نقل نہیں کیا جا رہا ہے نیز یہ کہ وہ اس قدر مشہور ہیں کہ کسی بھی واقف کار کی نگاہ سے پوشیدہ نہیں۔ تاہم جو لوگ اس بات سے باخبر نہ ہوں کہ وہ کون سی آیات و احادیث ہیں جن سے امور تصوف کا استنباط کیا گیا ہے اور کس طرح کیا گیا ہے، انہیں مولانا اشرف علی صاحب مرحوم و مغفور کی کتاب "التکشف عن مہمات التصوف" کا مطالعہ کر لینا بقدر ضرورت کافی ہوگا۔

شاید کوئی شخص بھی یہ کہنے کی جرأت نہ کرے گا کہ قرآن کی آیات اس باب میں زیادہ واضح ہیں اور آیات انجیل کے مقابلہ میں ان سے روحانی ایجادات کی اجازت کا سمجھا جانا زیادہ قرین قیاس ہے۔ پھر کوئی وجہ نہیں کہ ہم دین کے مجموعی مصالح کے نقطۂ نگاہ سے اپنے بزرگوں کے نظریۂ اجتہادات روحانی کو ویسا ہی نہ سمجھیں جیسا کہ قرآن نے عیسائی علما و رہبان کے نظریہ رہبانیت کو سمجھا اور سمجھایا؟ اس مسئلہ میں بزرگان دین کی توہین یا تضلیل کا کوئی سوال نہیں پیدا ہوتا، بلکہ ان کے اخلاص، زہد اور دیانت کا پورا پورا اعتراف و احترام کرتے ہوئے یہ بات کہی جا سکتی ہے، ٹھیک اسی طرح جس طرح قرآن نے سچے اہل رہبانیت کے زہد و ورع کا اعتراف کرتے ہوئے بھی ان پر تنقید کی۔ اور نہ صرف قرآن ہی میں ہم کو اس کی نظیر ملتی ہے بلکہ خود حضرات صوفیائے کرام کے یہاں بھی یہ بات موجود ہے۔ وہ ایک دوسرے کی جلالت شان کا اعتراف کرتے ہوئے بھی باہم ایک دوسرے پر تنقید کرتے اور افکار غیر کی تغلیط کرتے ہیں۔ حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ حضرت شیخ محی الدین ابن عربی کو کاملین میں شمار کرتے اور ان کا حد درجہ احترام کرتے ہیں، لیکن وحدۃ الوجود کے مسئلہ پر ان سے شدید اختلاف کرتے ہیں، اس نظریۂ وحدت کو ضلالت ٹھیراتے اور عقل و شرع دونوں کے صریح خلاف قرار دیتے ہیں۔ (مکتوبات امام ربانی)

سچ یہ ہے کہ دین سب سے بزرگ اور محترم ہے اور اس کے مصالح کو کسی شخصیت کے احترام پر قربان نہیں کیا جاسکتا۔

اصل واقعہ یہ ہے کہ دین کی جو تصویر محکمات اور منصوص ہدایات سے بنتی ہے وہی صحیح اور مکمل ہوتی ہے جب بھی اس تصویر کا خاکہ اشارات بعیدہ اور ذوقی اجتہادات سے بنایا جائے گا، اس میں عدم توازن کا پیدا ہو جانا ضروری ہے، خواہ اس کے بعض گوشوں میں کتنا ہی غیر معمولی حسن و جمال کیوں نہ پیدا ہو جائے۔ اہل رہبانیت اور اہل تصوف دونوں میں یہ چیز کچھ مشترک سی دکھائی دیتی ہے کہ انہوں نے کتاب الٰہی اور سنت رسول کے محکمات اور واضح ہدایات ہی پر دینی فکر و عمل کی بنیاد نہیں رکھی بلکہ دور دور کے اشارات اور تاویلات کو بھی اس میں داخل کر لیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ بعض ایسی چیزیں عملاً بنیادی اہمیت اختیار کر گئیں جن کو شریعت میں ایک لازمۂ بعیدہ کی حیثیت حاصل ہے، بالفاظ دیگر بعض ایسے حقائق کو بندگی رب کے سفر کا نقطۂ آغاز قرار دے لیا گیا جو راستے کے اتفاقی نشانات تھے یا کبھی کبھار دور سے چمک اٹھنے والے واقعی نشانات۔ ان سر راہے نشانات کی کشش اتنی غیر معمولی نکلی کہ ارباب شوق کو یارائے ضبط نہ رہا، لیکن ہم پھر عرض کریں گے کہ یہ روِیّہ اللہ اور اس کے رسول کے نزدیک پسندیدہ تر نہیں۔

حضرت شاہ ولی اللہ صاحب کی کتاب "فیوض الحرمین" فن سلوک طریقت

ہیں ایک ممتاز مقام کی مالک ہے جس میں انہوں نے تصوف کے احوال و مقامات کی بڑی جرأت آمیز ترجمانی فرمائی ہے اور ان کے حق میں بہت کچھ کہا ہے۔ لیکن اس کے باوجود اس میں یہ الفاظ بھی موجود ہیں۔

اِستاذنتُہٗ صلى الله عليه	میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم
وسلّم فی ردِما اوردہٗ	سے (حالت مشاہدہ میں) گذارش
علماءُ الحرمين على بعض	کی کہ علمائے حرمین نے بعض صوفیہ پر جو
الصوفیۃِ فلم یأذن	اعتراضات کیے ہیں ان کی تردید کی
لی ورأیتُ العلماء العاملین	اجازت مرحمت فرمائیے، تو آپ نے
وفوق علمِهم المشتغلین	اس کی اجازت نہیں دی۔ اور میں
بنوعٍ من التصفیۃ	نے دیکھا کہ آنحضرت کی جناب میں
الناشرینَ للعلمِ والدینِ	ان صوفیا کے بالمقابل وہ علماء زیادہ
اقربَ الیہ واکرمَ واحبَّ	مقرب، زیادہ معزز اور زیادہ
عندہٗ من ہؤلاءِ الصوفیۃِ	محبوب ہیں جو باعمل بھی ہیں اور جو کسی نہ کسی
وانِ کانوا اھلَ الفناء	طرز کے تزکیۂ النفس و اخلاق میں مصروف،
والبقاءِ والجذبِ الناشی	اور علم و دین پھیلانے میں مشغول
من صمیم النفسِ الناطقۃِ	رہتے ہیں خواہ یہ صوفیا تصوف
والتوحید وغیر ذالك	کے کسی بھی مقام پر کیوں نہ ہوں، مثلاً

من المقامات الشّامخة عند الصُّوفية	مقام فنا پر یا مقام بقا پر یا مقام جذب پر وہ جذب جو نفس ناطقہ

کی گہرائیوں سے پیدا ہوا ہو۔ یا مقام توحید پر غرض وہ سارے مقامات جو اہل تصوف کے نزدیک بلند شمار ہوتے ہیں۔

پھر اس فرقِ مراتب کی وجہ بھی شاہ صاحب موصوف خود ہی بیان کرتے ہیں:۔

بیانُ هذا المجمل ان ههنا طریقتین طریقۃٌ انتقلتْ الی الخلقِ بانتقالہٖ صلی اللہ علیہ وسلم وھی بالوسائط وھی ترجعُ الی تھذیب الجوارح بالطّاعات والقُوی النفسانیہ بالذّکرِ والتزکیۃ وحبِّ اللہِ والنبیِ صلی اللہ علیہ وسلم والی تھذیب النّاس نشراً للعلمِ وامراً بالمعرُوفِ وَ نھیاً عن المُنکرِ وَسعیاً فیما	اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ اللہ تک پہنچنے کے دو طریقے ہیں:۔ ایک طریقہ تو وہ ہے جو نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم کے ذریعہ خلق تک پہنچا ہے اور یہ طریقہ وسائط و ذرائع کا طریقہ ہے۔ یعنی یہ کہ احکام شرعیہ پر عمل کر کے اپنے ظاہر کی اصلاح کیجیے ذکر الٰہی، تزکیہ، محبت خدا اور محبت رسول کے ذریعہ اپنی باطنی قوتوں کو سنواریے اور اشاعت علم دین، امر بالمعروف نہی عن المنکر اور مفید عام مساعی نیز اسی طرح کی اور باتوں کے ذریعہ دوسرے لوگوں کو

يَنْفَعُ النَّاسَ عَامَّةً وَمَا نَيَاسِبُ
هٰذِهِ المذكورات وطريقة
بَيْنَ اللّٰهِ وَعَبْدِهِ مِنْ حَيْثُ
اَوْجَدَهُ فَوُجِدَ وَاَفَاضَهُ
فَفَاضَ وَلَيْسَ فِي هٰذِهِ وَاسِطَةٌ
اصلاً - وَمَنْ سَلَكَ فِي هٰذِهِ
فانما شانه اَنْ يَتَنَبَّهَ لحقيقة
اَنَا وَيَتَنَبَّهَ فِي ضمن هذا
التَّنَبُّهِ بِالْحَقِّ وَيَنْشَعِبُ مِنْ
ذَالِكَ الفناءُ والبقاءُ والجذبُ
والتوحيدُ وغيرُها - وكلامنا
فِي الطَّرِيقَةِ الثَّانِيَةِ اَنَّهَا
ليست عند النبي صلى اللّٰه
عليه وسلم بمنوهة ولا
مرغوبة لانَّهُ عليه الصلوٰة
والسلام عنوانُ فيضان الطريقة
الاُولىٰ وجعله اللّٰه وكراً

سدھارے - دوسرا طریقہ وہ ہے جو اللہ
اور اس کے بندے کے درمیان (بلا واسطہ)
ہے - اور اس پہلو سے ہے کہ اسی کے
ہست کرنے سے وہ ہست ہوا ہے اور
اسی کے فیضانِ خلق سے وہ عالم ظہور میں
آیا ہے (جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اصلاً
دونوں کے درمیان بالراست تعلق ہے)
- اس طریقۂ وصول الی اللہ میں سرے
سے کوئی درمیانی واسطہ نہیں جو شخص یہ
طریقہ اختیار کرتا ہے اس کو اپنے "انا"
کی حقیقت سے واقفیت بہم پہنچانی ہوتی ہے
اس واقفیت "انا" کے ضمن میں "حق" سے آگہی
حاصل ہو جاتی ہے اور پھر اس سے فنا، بقا،
جذب اور توحید وغیرہ کیفیات ابھرتی ہیں۔
اس دوسرے طریقہ کے بارے میں ہمارا یہ
کہنا کہ وہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے نزدیک
عمدہ اور پسندیدہ نہیں ہے، اس کی وجہ

لِعنایتہ بافاضتہا وفطنتہ ۔یہ ہے کہ آنحضرت پہلے طریقے کے
لِظہورھا (صفحہ ۵۰) نزول کا سر عنوان تھے، اور اللہ تعالیٰ نے
جب یہ طریقہ اہل جہان کو مرحمت فرمانا چاہا تو اس مقصد کے لیے آپ کو واسطہ اور اس کے
وجود کا قالب قرار دیا۔

فیوض الحرمین کے دوسرے مباحث کی طرح یہ عبارت بھی اگرچہ شاہ صاحبؒ کے مشاہدات روحانی کا ثمرہ ہے، اس لیے اصولاً اس قسم کی باتوں کو شرعی حجت کا مقام دینا صحیح نہیں، لیکن اس کے باوجود ہم نے یہ عبارت اس لیے نقل کی ہے تاکہ معلوم ہو جائے کہ خود ارباب تصوف غیر ماثور طرق و افکار اور اشغال و اذکار کی کیا حیثیت سمجھتے رہے ہیں اور انہیں ان چیزوں کی کیا حیثیت دکھائی اور سمجھائی گئی ہے۔ اگرچہ آگے چل کر مصنف ممدوح نے حسن تاویل کے ذریعہ اس طرف سے کافی مدافعت کی ہے مگر ایک بات تو اپنی جگہ قطعی ہے، اور وہ یہ کہ طریقۂ ماثور، یعنی طریقۂ رسول بہرحال افضل اور اعلیٰ ہے اور عام متبعانِ رسول کے لیے وہی مناسب طریقہ ہے۔ اسی میں پوری امان ہے، اسی کو مدارِ تزکیہ ٹھیرانا چاہیے، اسی میں اسوۂ رسول کی حقیقی اور کامل پیروی ہے۔ ہمارا دل اپنے اندر یہ جرأت نہیں پاتا کہ ہم اس طریقۂ بندگی پر اکتفاء نہ کریں جس کو ہمارے ہادی اعظم صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں اپنے قول سے اور اپنے عمل سے سکھایا ہے، جس کے آپ حامل تھے، جس کے آپؐ عنوان

فیضان" تھے ہم اپنے اندر یہ ہمت نہیں پاتے کہ وصول الی اللہ کے کسی ایسے طریقے کو اختیار کرلیں جس میں "اصلاً" کوئی "واسطہ" نہ ہو، یعنی ذات نبوی کی پیشوائی سے بے نیاز ہو۔ نہ ہم اس کے لیے تیار ہیں کہ اس طریقے کو کتاب و سنت میں کسی معقول ہدایت نہ ہونے کے باوجود صرف اس لیے اختیار کرلیں کہ کبار امت اور اولیائے عظام کا وہ معمول تھا۔ یقیناً یہ پاکباز ہستیاں ہماری انتہائی عقیدت اور احترام کی مستحق ہیں، ہم ان کی خاکِ پا کے بھی برابر نہیں، مگر اس کے باوجود ہمارے لیے بڑی مجبوری ہے اور شریعت کا پاس ہمارا دامن پکڑ لیتا ہے۔ ہمیں ان لوگوں کی داستان یاد ہے جنہوں نے اپنے فقہا اور اپنے مشائخ کو جوشِ عقیدت میں آکر عملاً وہ مقام دے دیا تھا جو صرف اللہ اور اس کے رسول کے لیے مخصوص ہے، اور اسی بنا پر قرآن نے ان پر الزام لگایا کہ:

اِتَّخَذُوْٓا اَحْبَارَهُمْ وَرُهْبَانَهُمْ اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ — انہوں نے اپنے عالموں اور اپنے درویشوں کو اللہ کے سوا اپنا رب بنا لیا تھا۔

اور اس الزام کی شرح زبان رسالت نے یہ فرمائی ہے کہ انہوں نے بلا دلیل و برہان ان چیزوں کو حلال ٹھیرالیا جن کو ان کے احبار و رہبان نے حلال کیا تھا اور اس چیز کو حرام مان لیا تھا جس کو انہوں نے حرام قرار دیا تھا یاد رکھیے اہل کتاب پر صرف یہی الزام نہیں لگایا گیا کہ انہوں نے اپنے احبار (علماء فقہاء) کو ارباب

بنا لیا تھا بلکہ رہبان (مشائخ) کے ضمن میں بھی یہی الزام لگایا گیا تھا۔ پھر یہ گمان بھی نہ کیجیے کہ یہ الزام صرف ان احبار اور رہبان کی اندھی تقلید کے پیش نظر لگایا گیا تھا جو بُرے اور دین فروش تھے کیونکہ قرآن میں اس طرح کی کوئی تخصیص نہیں کی گئی ہے، بلکہ اچھے بُرے سارے ہی عالموں اور راہبوں کے سلسلے میں یہ بات فرمائی گئی ہے چنانچہ اس کے بعد وَالْمَسِيحَ ابْنَ مَرْيَمَ کا لفظ بھی آتا ہے۔ جن کے متعلق اس قسم کا گمان بھی نہیں کیا جا سکتا۔ اور سچ تو یہ ہے کہ اس قسم کی خالی عقیدت برے اور دین فروش عالموں اور صوفیوں سے پیدا بھی نہیں ہوتی۔ یہ ظلم تو عموماً ہمیشہ صالح علماء و مشائخ ہی کے اوپر کیا گیا ہے کہ ان کے دنیا سے اٹھتے ہی ان کو "رب" بنا لیا گیا۔ غرض اہل کتاب کو اپنے رہبان کو رب بنانے والا جو کہا گیا تو اس کی وجہ اس کے سوا اور کیا ہو گی کہ رہبانیت کے تصور اور اس کے متعلقات کو انہوں نے محض اس بنا پر اصل دین ٹھہرا لیا تھا کہ وہ ہمارے محترم بزرگوں کے اختیار کردہ ہیں۔ پس ہمیں اندیشہ ہے کہ اگر ہم بھی اپنے اسلاف کرام اور بزرگان دین کے احترام میں حد سے آگے بڑھ گئے اور ان کے فرمودات اور مختارات کو محض ان کے فرمودات و مختارات ہونے کے سبب ہم نے ترک و اختیار کی بحث سے بالاتر قرار دے لیا تو قرآن کے اس اصول تنقید سے ہم بھی محفوظ نہ رہ سکیں گے۔

یاد رہے کہ یہ افضلیت اور مفضولیت کا فرق اذکار ماثورہ کے مقابلہ

یں صرف ان اشغال و اذکار کا ہے جو اگرچہ غیر مسنون ہیں مگر ان کا مزاج دین کے مزاج سے ہم آہنگ ہے - ایسے اذکار کو بس گوارا کیا جا سکتا ہے بشرطیکہ آدمی ان کو وہ اہمیت نہ دے جو اللہ اور اس کے رسول کے ارشادات کی ہوتی ہے اور نہ ان کی اس طرح تبلیغ و تلقین کرتا پھرے جیسی کہ مسنون اعمال و اذکار کی ہوتی ہے یا ہونی چاہیے، لیکن ان اعمال و اذکار کو تو ایک لمحے کے لیے بھی برداشت نہیں کیا جا سکتا جن کا مزاج مزاج شرع سے میل نہ کھاتا ہو -

یہ مسئلہ گوناگوں حیثیتوں سے بڑا اہم بھی ہے اور بڑا نازک بھی، لیکن اجمالی اشارات پر ہم اکتفا کرتے ہیں اور تفصیلی گفتگو کو کسی اور فرصت کے لیے اٹھا چھوڑتے ہیں -

بحث "نماز" کے بعض اہم پہلو ابھی اور رہ جاتے ہیں، لیکن ان کا تعلق چونکہ "صبر" سے بھی ہے اس لیے ان پر گفتگو اسی کے ساتھ مناسب ہوگی -

باب پنجم

(۴) صبر

صبر کی حقیقت اساس دین کا چوتھا اور آخری بنیادی پتھر صبر ہے۔ صبر کا ہمارا ایک عرفی مفہوم ہے، ایک عرب کا لغوی مفہوم ہے، اور ایک شرعی اصطلاحی مفہوم:۔

عرفی مفہوم یہ ہے کہ انسان مصائب و آلام پر بے قرار نہ ہو۔ آہ و فغاں نہ کرے، واویلا نہ مچائے، بلکہ جذبات کو قابو میں رکھے۔

لغوی مفہوم یہ ہے کہ کسی اور کو، یا خود اپنے آپ کو، ناگوار خاطر حالت میں روک رکھا جائے، اگرچہ اس حالت سے نکل آنے کی راہ کھلی ہو، گویا مشکل حالات میں ثبات و استقلال کا دوسرا نام صبر ہے۔

شرعی اور اصطلاحی مفہوم یہ ہے کہ کوئی حالت بھی ہو، ناپسند خاطر ہو یا اور پسند خاطر ہو تو، ہر حال میں انسان دین کے تقاضوں اور بندگی کی ذمہ داریوں

کو نبھائے اور ایک طرف تو اسے حالات کی ناسازگاریاں اور راہِ حق کی آزمائشیں، اعدائے دین کی فتنہ انگیزیاں اور بندگانِ ہوا کی مخالفتیں حدودِ شرع سے ہٹنے نہ دیں، دوسری طرف دنیا کی زینتیں اور سامانِ عیش کی فراوانیاں، نام و نمود کی رغبتیں اور جاہ و حشمت کی مطلق العنانیاں بھی اس کے پائے استقلال کو منہاجِ شریعت سے بیگانہ نہ ہونے دیں، اور پھر تیسری طرف ایسا بھی ہو کہ ذاتی میلانات اور شخصی اذواق، خاندانی روایات اور آبائی رسوم، قومی تعصبات اور وطنی مفادات، وقت کے فتاوے اور زمانے کے فیصلے سب کے سب اپنا زور دکھا کر تھک کے ہار جائیں، مگر مومن اپنی شاہراہ ہدایت پر بدستور جارہے۔

لیکن صبرِ شرعی کے مفہوم کی یہ جامعیت عام طور سے کم ہی مدِّ نظر ہوا کرتی ہے، اور بالعموم قرآن میں اس کا مفہوم تھوڑے سے تغیر کے ساتھ وہی لیا گیا ہے جو صبرِ لغوی کا ہے، یعنی دین کی خاطر پیش آنے والے مصائب و شدائد میں ثابت قدم رہنا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ باقی باتیں صبرِ شرعی کی اصل حقیقت نہیں ہیں بلکہ اس کے ثانوی تقاضے ہیں۔ بہرحال صبرِ عرفی سے صبرِ لغوی، اور پھر صبرِ لغوی سے صبرِ شرعی وسیع تر مفہوم کا حامل ہے۔

صبر کی اہمیت

بنائے دین کا آخری پتھر جس کے بعد اس کی تعمیر مکمل ہو جاتی ہے، اور اب اس کے اوپر دین کا قصرِ رفیع بڑی آسانی سے اور تھوڑے ہی دنوں میں اٹھایا جاسکتا ہے، یہی صبر اور اس کی یہی وسیع

اور ہمہ گیر حقیقت ہے، آپ قرآن مجید اٹھا لیجیے اور کسی نبی کی تاریخ دعوت پڑھنا شروع کر دیجیے، آپ دیکھیں گے کہ اس کی اولین ہدایات میں جن چیزوں کی تلقین ہے ان میں نہ صرف یہ کہ صبر ضرور ہے، بلکہ اس پر غیر معمولی زور بھی دیا گیا ہے۔ اور پھر اگر اس دعوت کو کامیابی حاصل ہوئی ہے تو وہ آخری شرط جس کو پورا کرنے کے بعد ہی یہ وقت ہما یوں آیا، یہی صبر ہے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو دوسری ہی وحی میں یہ ہدایت دی گئی ہے:۔

...... وَلِرَبِّكَ فَاصْبِرْ ۔ (مدثر) ...... اور اپنے رب کی رضا کیلیے صبر کر۔

چند دن ٹھیر کر یہ ہدایت پھر دہرائی گئی:۔

وَاصْبِرْ عَلَىٰ مَا يَقُولُونَ وَاهْجُرْهُمْ هَجْرًا جَمِيلًا ۔ (مزمل) یہ کفار جو کچھ تمہاری مخالفت میں، کہتے ہیں اس پر صبر کرو، اور عمدگی کیساتھ ان سے علیحدہ ہو جاؤ

یہ سورتیں (مدثر اور مزمل) بالکل آغاز نبوت کی سورتیں ہیں، اس لیے یہ تلقینات صبر بھی نبی کے لیے اولین ہدایات میں سے ہیں۔ پھر جوں جوں دعوت و تبلیغ کا دائرہ وسیع ہوتا گیا، اور نتیجۃً جس جس طرح مشکلات و موانع کی آندھیاں تیز سے تیز تر ہوتی گئیں، ان تلقینات صبر کا بھی پیہم اعادہ ہوتا رہا، نہ صرف نبی کے لیے، بلکہ اس سے کہیں بڑھ کر اصحاب نبی کے لیے بھی۔ مٹھی بھر جماعت اپنے آپ کو اس حال میں پا رہی تھی گویا سرزمین عرب کا ذرہ ذرہ اسے نگل جانا چاہتا ہے، اور سارے مادی اسباب اکٹھے ہو کر

اسے بیخ و بن سے اکھاڑ کر پھینک دینا چاہتے ہیں۔ ادھر صرف جماعت کی تعداد ہی مختصر نہ تھی بلکہ ظاہری سر و سامان بھی ناپید تھے۔ حکم ہوا کہ:-

يٰاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اسْتَعِيْنُوْا بِالصَّبْرِ وَالصَّلٰوةِ اِنَّ اللّٰهَ مَعَ الصّٰبِرِيْنَ۔ (بقرہ - ۱۴۰)

اے ایمان والو! (ان حالات کے مقابلے کے لیے) صبر اور نماز کے ذریعہ مدد لو یقیناً اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے۔

يٰاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اصْبِرُوْا وَصَابِرُوْا وَرَابِطُوْا وَاتَّقُوا اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ (آل عمران ۲۰۰)

اے ایمان والو! خود صبر اختیار کرو، دوسروں کو صبر کی تلقین کرو، باہم جڑ کر رہو، اور اللہ سے ڈرو، تاکہ کامیاب ہو سکو۔

یہ "اِصْبِرُوْا" کی صدا مسلسل گونجی، اور اس انداز میں گونجتی رہی گویا یہی صبر وہ تنہا ہتھیار رہ ہے جس سے مشکلات کے ہجوم کو زیر و زبر کیا جا سکتا اور حق و باطل کا یہ معرکہ سر کیا جا سکتا ہے۔ یہی قلت تعداد کا بھی بدل ہے اور سر و سامان کار کی کمی کا بھی۔ چنانچہ یہ بتا بھی دیا گیا کہ ایسا کیوں ہوگا؟ ایسا اس لیے ہوگا کہ "صبر اختیار کرنے والوں کے ساتھ خود اللہ ہوتا ہے" اور کون ہے جو اس لشکر کو ہرا دینے کا حوصلہ کر سکے جس کی آستینوں میں سے خود اللہ کا ہاتھ نبرد آزمائی کر رہا ہو!

پھر یہی نہیں کہ صبر ہی حق و باطل کی کشاکشوں میں کامیابی کی شاہ کلید ہے بلکہ کسی گروہ کا صدق ایمانی اسی وقت اللہ کے حضور سند قبول حاصل

کرتا ہے جب وہ صبر و استقامت کا ثبوت مہیا کر دے:۔

لَيْسَ الْبِرَّ اَنْ تُوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ قِبَلَ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ وَلٰكِنَّ الْبِرَّ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ ..... وَالصّٰبِرِيْنَ فِى الْبَاْسَآءِ وَالضَّرَّآءِ وَحِيْنَ الْبَاْسِ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ صَدَقُوْا وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُتَّقُوْنَ۔ (بقرہ ۱۷۲)

نیکی یہ نہیں ہے کہ تم نے پورب یا پچھم کی طرف اپنے رُخ کر لیے، (اور نہ) ایسے لوگ فی الواقع نیک ہیں، بلکہ نیکی در اصل ان کی ہے جو اللہ پر ایمان لائیں ..... اور بالخصوص یہ بات کہ وہ بھوک اور بیماری میں اور لڑائی کے وقت صبر و استقامت سے کام لیں یہی لوگ ہیں جو اپنے دعوائے ایمان میں سچے ہیں اور یہی وہ لوگ ہیں جو متقی ہیں۔

گویا حقیقی معنوں میں اگر کوئی ہدایت یاب اور مستحق رحمت گروہ ہے ... ... تو وہ یہی صابروں کا گروہ ہے۔ دوسری جگہ فرمایا:۔

..... وَبَشِّرِ الصّٰبِرِيْنَ الَّذِيْنَ اِذَآ اَصَابَتْهُمْ مُّصِيْبَةٌ قَالُوْٓا اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّآ اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ اُولٰٓئِكَ عَلَيْهِمْ صَلَوٰتٌ مِّنْ رَّبِّهِمْ وَرَحْمَةٌ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُهْتَدُوْنَ (بقرہ)

..... اے نبی صبر کرنے والوں کو (خوشنودیٔ حق) کی بشارت سُنا دو جنہیں اگر کوئی مصیبت پہنچی ہے تو کہتے ہیں "ہم اللہ کے ہیں اور ہمیں اسی کے حضور پلٹ کر جانا ہے" یہی وہ لوگ ہیں جن پر ان کے رب کی طرف سے عنایتیں ہوں گی اور جو اس کی رحمت کے مورد

ہیں اور یہی وہ لوگ ہیں جو ہدایت یاب ہیں۔

اب غور فرمائیے، صبر کا دین میں کیا مقام ہے! اور وہ کس طرح ایمان اور ایمانی زندگی کے آغاز کو بھی محیط ہے اور انجام کو بھی! یہ گمان نہ ہو کہ دین کے اندر صبر کو یہ بنیادی اہمیت بس دعوتِ قرآنی ہی میں حاصل ہے۔ نہیں دعوتِ حق کی پوری تاریخ کا ایک ایک باب صبر کی اسی اساسی حیثیت کا گواہ ہے۔ دعوتِ موسوی کی شہادت اوپر ابتدائی مباحث میں آپ کی نگاہوں سے گذر چکی ہے۔ وہاں آپ دیکھ چکے ہیں کہ کوہ طور پر جو سب سے پہلی وحی حضرت موسیٰ علیہ وعلی انبیا الصلوۃ والسلام پر نازل ہوئی اس میں خود حضرت موسیٰ کو صبر و ثبات کی ہدایت فرمائی جاتی ہے (وَلَا يَصُدَّنَّكَ عَنْهَا مَنْ لَّا يُؤْمِنُ بِهَا) اور جب دعوت شروع ہوتی ہے اور کچھ لوگ ایمان لاتے ہیں اور فرعونی اقتدار ان پر عرصۂ حیات تنگ کر دیتا ہے تو بعینہٖ یہی ہدایت ان مومنوں کو بھی دی جاتی ہے:۔

قَالَ مُوْسٰى لِقَوْمِهِ اسْتَعِيْنُوْا بِاللّٰهِ وَاصْبِرُوْا (اعراف ۱۲۵)	موسیٰ نے اپنی قوم سے کہا کہ اللہ سے مدد مانگو اور صبر اختیار کرو۔

حتیٰ کہ جب فرعونی مظالم کے آہنی پنجے سے انہیں نجات ملتی ہے تو وہ بھی اسی صبر ہی کے طفیل:۔

تَمَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ الْحُسْنٰى	بنی اسرائیل پر تیرے رب کا کلمۂ خیر پورا

عَلٰی بَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ بِمَا صَبَرُوْا — ہو کر رہا بوجہ ان کے صبر اختیار کرنے کے۔ (اعراف ۱۳۷)

تاریخ ہدایت کے ان سے بھی قدیم صفحات اگر آپ الٹ کر دیکھیں گے تو ایک ایک صفحہ اسی روشن حقیقت کا گواہ ثابت ہوگا۔

پھر صبر و استقامت کی ان سعادت بخشیوں کو صرف اسی پار کی زندگی تک محدود نہ سمجھئے۔ اُس پار کی زندگی، حقیقی اور ابدی زندگی، میں بھی خوش بخت وہی ہوں گے جو اپنے ساتھ صبر کا توشہ لے کر حاضر ہوئے ہوں۔ چنانچہ حق تعالیٰ نیکو کاروں کو اپنی مغفرت اور رحمت کا انعام عطا کرتے ہوئے فرمائے گا:۔

اِنِّیْ جَزَیْتُھُمُ الْیَوْمَ بِمَا صَبَرُوْٓا — آج کے دن میں نے ان کو یہ جزائے خیر اس صبر کے سبب دی ہے جس کا انھوں نے (دنیوی زندگی میں) مظاہرہ کیا تھا۔

اور اس بخشش اور بنائے بخشش کا اعلان کچھ اسی دن یکایک نہیں ہوگا، بلکہ اس کی اطلاع ہمیں یہیں دی جا چکی ہے:۔

اُولٰٓئِکَ یُجْزَوْنَ الْغُرْفَۃَ بِمَا صَبَرُوْا (فرقان ۷۵) — انہیں اجر میں (جنت کے) بالاخانے ان کے صبر کے باعث دیئے جائیں گے۔

اہمیت صبر کی وجہ صبر کو یہ غیر معمولی اہمیت کیوں حاصل ہے، بالخصوص ایسی شکل میں کہ وہ دین و ایمان کی کوئی مثبت حقیقت

بھی نہیں ہے؟ ایمان باللہ، ایمان بالآخرت اور نماز کو دین و تعمیر دین میں جو بنیادی حیثیتیں حاصل ہیں، ان کے لیے ان کی ایجابی نوعیت بجائے خود ایک بڑی بلکہ اصلی سفارش ہے، مگر صبر تو کچھ "ہونے" یا "کرنے" کا نام نہیں، وہ تو کچھ نہ "ہونے" یا "نہ کرنے" کا نام ہے۔ ایسی حالت میں دین کے اندر صبر کی یہ اہمیت ایک قابل غور مسئلہ ہے۔ آیئے اسے سمجھنے کی کوشش کریں۔

اساس دین کی مذکورہ بالا جن تین بنیادوں کو آپ مثبت حقیقتیں قرار دیتے ہیں، بلاشبہ ان کی ایجابی نوعیت کے ساتھ ساتھ ان کی غیر معمولی عظمت و فضیلت بھی اپنا کوئی نظیر نہیں رکھتی، اور اس پہلو سے صبر ہرگز ان کا مد مقابل نہیں ہو سکتا۔ لیکن اس کے باوجود یہی صبر، یہی منفی حقیقت اپنے اندر ایک ایسی شان امتیاز بھی رکھتی ہے جو کسی اور میں نہیں پائی جاتی۔ ایمان باللہ، ایمان بالآخرت اور نماز وہ چیزیں ہیں جن کے اندر غلط بیانیوں اور فریب کاریوں سے کام لیا جا سکتا ہے، مگر صبر کے اندر اس کا کوئی امکان نہیں۔ دوسری چیزیں بنائے حق تو ضرور ہیں مگر ان کا اظہار و مظاہرہ نمائشی اور ریاکارانہ بھی ہو سکتا ہے مگر صبر کا مظاہرہ نمائشی نہیں ہو سکتا، اور اگر کسی نے اس کی زبردستی کوشش کی بھی تو اس میں کامیاب نہیں ہو سکتا۔ پھر بات صرف اتنی ہی نہیں ہے کہ بجائے خود صبر کا کھوٹا سکہ نہیں چلایا جا سکتا بلکہ باقی تینوں سکوں کا کھرا پن بھی اسی سے معلوم ہوتا ہے۔ دراصل جو چیز اللہ کو مطلوب ہے وہ تو صرف ایمان باللہ ہے اور اس ایمان کے صحیح تقاضے، رہا ایمان بالآخرت تو وہ

اسی ایمان باللہ کے تقاضوں کی تکمیل کے لیے ہے، اور نماز ان ہی دونوں ایمانوں کا خارجی ظہور ہے، جیسا کہ ہم تفصیل سے بتا چکے ہیں۔ مگر یہ ہر شخص جانتا ہے کہ ایمان باللہ اگر کہیں اپنے اندر صدق و اخلاص کا جوہر رکھتا ہے تو کہیں نفاق دریا کی نقاب اوڑھے بھی نمودار ہوتا ہے۔ دو زبانیں ہوتی ہیں اور دونوں سے یکساں بلند آہنگی کے ساتھ آمنا باللہ کے نعرے بلند ہوتے رہتے ہیں، دراں حالیکہ ایک کا نعرہ نیچے قلب کی گہرائیوں سے اٹھ کر زبان تک آتا ہے، اور دوسرے کا وہیں کا نہیں، زبان ہی پر جنم لیتا ہے۔ اس لیے ضرورت ہوئی کہ سچ کو جھوٹ سے الگ کیا جائے اور ایمان صادق و ایمان کاذب کے درمیان امتیاز کی کوئی صورت پیدا کی جائے۔

اللہ تعالیٰ کا قانون آزمائش

اللہ تعالیٰ نے امتیاز کی یہ صورت روز اوّل ہی سے متعین فرما رکھی ہے، جس کا نام قرآن میں سنت ابتلاء یعنی قانون آزمائش ہے۔ ظاہر بات ہے کہ ادعائے ایمان کی صداقت اگر معلوم کی جا سکتی ہے تو صرف ایک طریقے سے، اور وہ ہے اس کے تقاضوں پر عمل کرنے کا جائزہ۔ کسی چھپی ہوئی اور ان دیکھی حقیقت کا وجود آدمی اسی وقت تسلیم کرتا ہے جب اس کے لوازم کا مشاہدہ کر لے۔ یہی لوازم اور مقتضیات وہ معیار ہیں جن پر کسی شے کے واقعی وجود کو جانچا اور پرکھا جا سکتا ہے اور پھر اس کے ہونے یا نہ ہونے کا فیصلہ کیا جا

سکتا ہے۔ پس کوئی وجہ نہ تھی کہ حیاتِ انسانی کی سب سے اہم حقیقت یعنی ایمان کو محض اس ہوائی تموّج کی بنا پر تسلیم کر لیا جاتا جو اٰمَنْتُ بِاللہِ کے الفاظ کہنے سے فضا میں پیدا ہو جاتا ہے، اور اللہ تعالیٰ ہر اس شخص کو اپنی وفادارانہ بندگی کی سند عطا فرما دیتا جس نے اپنی زبان سے اس کا دعویٰ کر دیا ہو۔ اس نے تو انسان کو پیدا ہی اس غرض سے کیا تھا کہ اس کے احساسِ فرضِ بندگی کو آزمایا جائے اور دیکھا جائے کہ کون اس کا بندہ بن کر رہتا ہے (خَلَقَ الْمَوْتَ وَالْحَیٰوۃَ لِیَبْلُوَکُمْ اَیُّکُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا) پھر یہ کتنی عجیب بات ہوتی اگر وہ لوگوں کے محض زبانی دعووں کو سن کر انہیں اس امتحان میں کامیاب قرار دے دیتا۔ اس نے یہ تو نہیں فرمایا ہے کہ بنی نوعِ انسان کو اس لیے پیدا کیا گیا ہے تاکہ دیکھا جائے کون اللہ پر ایمان لانے کا اعلان کرتا ہے، بلکہ یہ فرمایا ہے کہ:۔ اَیُّکُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا۔ تم میں سے کون عمل میں اچھا نکلتا ہے۔" پس ضروری تھا کہ ایمان کے دعووں کو عمل کی کسوٹی پر پرکھا جائے۔

یوں تو دنیا کا کوئی کام اور مقصد نہیں جو بغیر کسی جدوجہد کے محض زبانی دعووں سے پورا ہو جائے، مگر وہ مقصد جو اپنی عظمت میں آپ اپنی نظیر ہو، اس کے لیے سعی و جہد کی کوئی معمولی مقدار ہرگز کافی نہیں ہو سکتی۔ اللہ پر ایمان، اس کی بندگی، اس کے دین کی پیروی اور پھر اس کی اقامت کا مقصد وہ مقصد ہے جس کے لیے بڑی ہی پختہ عزیمت کی ضرورت ہے۔ آپ

کوئی مقصود لے کر اٹھیں، راہ میں رکاوٹیں کہیں کہیں پیش آئیں گی، لیکن یہ مقصود گراں تو ایسا ہے جس کی راہ میں دور دور تک بھاری چٹانوں، گہرے غاروں، سنگلاخ وادیوں کے سوا اور کچھ نظر ہی نہیں آتا۔ کسی اور شے کا نام لیجیے، اگر ایک طرف سے مخالفت کی ہمت شکن صدا بلند ہو گی تو تین طرف سے حوصلہ افزائی کی آوازیں بھی آئیں گی، مگر اللہ کا نام لیجیے اور دیکھیے کہ ہر سمت سے جگر شگاف نعرے گونج اُٹھتے ہیں۔ کسی تحریک کا علم اٹھا لیجیے، مشکلوں اور مخالفتوں کی بارش ہی کیوں نہ ہونے لگے، مگر کہیں نفس کی لذت، کہیں شہرت کی ہوس کہیں خاندان کی حمایت، کہیں قوم کی عقیدت، کہیں کسی خاص طبقے کی تحسین کہیں حب وطن کی سند، غرض کوئی نہ کوئی چیز دل کو گرمانے اور تسلی دینے کے لیے ضرور موجود ہو گی، مگر دین کی دعوت دیجیے، پھر دیکھیے وطن کی زمین آپ کے لیے تنگ ہو جاتی ہے، قوم غداری کے القاب سے نوازتی ہے، ملت طعنوں اور افترا پردازیوں سے استقبال کرتی ہے۔ خاندان برداشت کرنے سے انکار کر دیتا ہے۔ حتیٰ کہ خود اپنا نفس بھی آمادۂ پیکار ہو جاتا ہے۔ لہٰذا اس خوش فہمی میں نہ رہنا چاہیے کہ غلط مقاصد کے لیے بیشک مشکلات اور مصائب کا سامنا ہو، مگر جس مقصد کی بنا رضائے الٰہی پر ہو، اس کی راہ تو بڑی ہموار اور آسان گذار ہو گی۔ اس کے برعکس صورت واقعہ یہ ہے کہ وہ انتہائی دشوار گذار راہ ہے، اتنی کہ اس کی دشوار گذاریاں مقابلۃً کسی

گنا ہیں۔ یعنی بات صرف اتنی ہی نہیں ہے کہ اس عالم کے عام دستور کے مطابق جس طرح اور مقاصد کا حصول کم وبیش کچھ نہ کچھ قربانیوں پر موقوف ہے، اسی طرح اس مقصد کے لیے بھی کچھ قربانیاں دینی پڑتی ہیں، بلکہ قرآن کہتا ہے کہ یہاں عام دستور سے بھی کہیں بڑھ کر مشکلیں برداشت کرنا ہوتی ہیں، اور محض ان ہی مصائب اور موانع سے سابقہ نہیں ہوتا جو اسباب عام کے تحت پیش آجائیں، بلکہ اللہ تعالیٰ بالقصد ایسے حالات سے دوچار کراتا رہتا ہے جو ناگوار خاطر ہوں، ایسے مواقع پیدا کر کے رہتا ہے جن میں جان و مال کا زیان ہو اور ایسی باتوں کو کانوں میں پہنچتے رہنے کا اہتمام کرتا رہتا ہے جو جذباتِ نفس پر شاق ہوں۔ وہ کہتا ہے:۔

وَلَنَبْلُوَنَّكُمْ بِشَيْءٍ مِنَ	ہم تمہیں کچھ (خطرات جنگ کے) خوف سے
الْخَوْفِ وَالْجُوعِ وَنَقْصٍ مِنَ	کچھ فاقوں سے اور مال، جان اور پیداوار
الْأَمْوَالِ وَالْأَنْفُسِ وَالثَّمَرَاتِ	کے نقصان سے ضرور آزمائیں گے۔

اور جب زمانہ نبوت میں چھوٹے لوگ اس قانون آزمائش کی تاب نہ لا کر اس صورت حال سے گھبرا گھبرا کر چھٹنے لگے تو فرمایا:۔

أَحَسِبَ النَّاسُ أَنْ	کیا ان لوگوں نے یہ گمان کر رکھا تھا کہ وہ بس
يُتْرَكُوا أَنْ يَقُولُوا آمَنَّا وَهُمْ	اتنا کہہ دینے پر کہ "ہم ایمان لائے" یوں ہی چھوڑ
لَا يُفْتَنُونَ۔ (عنکبوت-۲)	دیئے جائیں گے اور انہیں آزمایا نہ جائے گا۔

اور ساتھ ہی یہ بھی واضح کر دیا کہ یہ تمہارے سلسلے میں کوئی نرالا رویہ نہیں اختیار کیا گیا ہے بلکہ ہماری ہمیشہ سے یہی سنت چلی آرہی ہے۔ ابتلاء و آزمائش کا یہ "خنجر" بہت قدیم ہے اور وہ ابتداء ہی سے "دوستوں" کے لیے ہمارا مخصوص تحفہ رہا ہے

وَلَقَدْ فَتَنَّا الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ (عنکبوت۔۳) اور ہم نے ان سبھی (مدعیان ایمان) کو آزمایا تھا جو ان سے پہلے گذر چکے ہیں۔

آزمائشوں کا تنوع

گو آیات مذکورہ سے یہ بات روشنی میں آجاتی ہے کہ ایمان کی راہ پر قدم رکھنے والوں کو آزمائشوں کے دور سے گذرنا لازمی ہے، اور ایک نظری انسان کو تو اتنی روشنی بس کرتی ہے، لیکن ایک عملی انسان کو، ایسے انسان کو، جو اس حقیقت کا علم صرف برائے علم نہ حاصل کرنا چاہتا ہو بلکہ برائے عمل چاہتا ہو، اس سے زیادہ تیز روشنی کی ضرورت ہے۔ وہ چونکہ دور کا تماشائی نہیں بلکہ بذاتِ خود اس راہ کا راہرو ہے۔ اس لیے وہ اس کے ایک ایک نشیب و فراز کو اپنی آنکھوں دیکھ لینا چاہے گا۔ وہ بس اتنا جان کر خاموش اور بے فکر نہ ہو سکے گا کہ ایمان کی صراطِ مستقیم مشکلات سے گھری ہوئی ہے، بلکہ اسے تجسس ہوگا کہ یہ مشکلیں کس طرح کی ہوں گی، تاکہ ان کے لیے وہ پہلے سے اپنے دل و دماغ کو تیار کرے، اور اچانک ان کا سامنا ہو جانے پر انتشار فکر و عمل

کا شکار نہ ہو جائے۔ اس لیے ہم ان مشکلات و مصائب کا ذرا تفصیلی جائزہ لیں گے اور یہ معلوم کرنے کی کوشش کریں گے کہ اللہ تعالیٰ کا یہ قانونِ آزمائش کن کن شکلوں میں ظہور کرتا ہے، اور کن کن طریقوں سے علم بردارانِ حق کو آزمایا جاتا ہے۔ اور سچ تو یہ ہے کہ اس کے بغیر ان مصائب کی سختیوں کا نظری طور سے بھی صحیح اندازہ نہیں ہو سکتا۔

قرآن کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ آزمائشیں ہر جہتی ہوتی ہیں۔ انسان کو ہر طرف سے ٹھونک بجا کر دیکھا جاتا ہے۔ اس کے دل و دماغ کا ایک ایک گوشہ چھانا جاتا ہے، اور اس کے جذبات کا کوئی تار نہیں جس پر مضرابِ ابتلاء کی ضرب نہ پڑتی ہو۔ ان آزمائشوں کو ہم حسبِ ذیل چار موٹی موٹی قسموں میں تقسیم کر سکتے ہیں:۔

(۱) عوام فریب پروپگنڈے

اس زبردست امتحان کی ابتدا عوام کو بھڑکا دینے والے پرفریب پروپگنڈہ سے ہوتی ہے۔ داعیِ حق صاف صاف لفظوں میں دنیا کی سب سے بڑی سچائی کا پیغام دیتا ہے، اور اس بات کے قوی امکانات ہوتے ہیں کہ اس کی فطری، مدلل اور دل نشین دعوتِ عام لوگوں کو اپیل کر جائے گی کہ وقت کے سیاسی اور مذہبی اجارہ داروں کی طرف سے انکار و تکذیب کا مظاہرہ شروع ہو جاتا ہے، لیکن اس کے باوجود جب دعوت کی قوت

تسخیر کچھ دلوں کو فتح کر ہی لیتی ہے تو اس کی "خطرناکیوں" کا احساس بھی تیز ہو جاتا ہے اور یہ مظاہرہ تکذیب عوام فریب پروپگنڈوں کے طوفان میں تبدیل ہو جاتا ہے جس کی تیز و تند لہروں میں داعی حق کی معصوم تمنائیں تنکوں کی طرح بہنے لگتی ہیں:۔

وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رَّسُوْلٍ وَّلَا نَبِيٍّ اِلَّآ اِذَا تَمَنّٰٓى اَلْقَى الشَّيْطٰنُ فِيْٓ اُمْنِيَّتِهٖ (حج)	اے پیغمبر! ہم نے تم سے پہلے جس رسول یا نبی کو بھی بھیجا، (اس کو ضرور اس صورتِ حال سے سابقہ پیش آیا کہ) اس نے (اپنی دعوت پہنچانے کی) تمنا کی نہیں کہ شیطان نے اس میں دخل اندازی کر دی۔

تمنائے نبوت میں یہ شیطانی دخل اندازیاں کیوں کر ہوتی ہیں؟ اس کی شرح بھی قرآن ہی سے سنیے:۔

وَكَذٰلِكَ جَعَلْنَا لِكُلِّ نَبِيٍّ عَدُوًّا شَيٰطِيْنَ الْاِنْسِ وَالْجِنِّ يُوْحِيْ بَعْضُهُمْ اِلٰى بَعْضٍ زُخْرُفَ الْقَوْلِ غُرُوْرًا۔ (انعام-۱۱۲)	اور اے نبی! جس طرح آج تمہارے معاندہو رہا ہے، اسی طرح ہم نے ہر نبی کے لیے شیاطین انس و جن کو (دعوت حق کا) دشمن بنا کر کھڑا کیا تھا، جو ایک دوسرے کو خوش نما باتیں سکھاتے، کہ (خلق خدا کو) مبتلائے فریب کر دیں۔

"زخرف القول" جس کا ترجمہ ہم نے "خوش نما باتیں" کیا ہے، ان باتوں کو کہتے ہیں جو ہوں تو بے اصل، مگر ایسے انداز میں کہی گئی ہوں کہ عام لوگوں کو مسحور کرلیں، جن کے اندر کوئی دینی اور اخلاقی اور عقلی جوہر تو نہ ہو مگر اوپر حسن عقیدت کی ملمع کاری کر دی گئی ہو۔ عوام الناس یوں بھی کہاں کے نکتہ رس اور صاحب فکر و تمیز ہوتے ہیں، لیکن جب ان کی ساری دین داری صرف چند خوش عقیدگیوں میں سمٹ آئی ہو تو ان کے جذبات دینی کی نزاکت اپنی انتہا کو جا پہنچتی ہے۔ ایسے وقت میں ان کے اُن محبوب تصورات کو جنہیں پوری متاع دین لٹا کر انہوں نے بکمال حفاظت اپنے نہاں خانۂ عقیدت کی زینت بنا رکھا ہو، چھیڑ دینا کتنا خطرناک کام ہے، اس کا اندازہ کرنا چنداں دشوار نہیں۔ ہوشیار مخالفینِ حق نے ہمیشہ ان مؤثر اور ساتھ ہی آسان چٹکلوں کو بڑی ہی فراخدلی سے استعمال کیا ہے، اور بسا اوقات خدا کے ان سادہ لوح بندوں کو، جو دعوت حق سے قریب ہو رہے تھے، بس ایک "زخرف القول" سے اتنا دور کر دیا کہ پھر ان کے کانوں تک اس دعوت کی گونج بھی نہیں پہنچائی جا سکی۔

شاید مثالوں کے ذریعہ یہ بات زیادہ وضاحت سے سامنے آ سکے گی۔ اس لیے ان چند ایک "اقوال مُزخرفہ" پر نظر ڈال لینی چاہیے جو دعوت قرآنی کی مقاومت میں قریش مکہ اور یہود و منافقین مدینہ کی جانب

سے کہے، سکھائے اور پھیلائے گئے تھے:۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی نبوت کا اعلان کیا، جواب دیا گیا کتنی عجیب بات ہے! ایک ہمارے ہی جیسا انسان اللہ رب العالمین کا ایلچی بن جائے! بھلا دنیا جہاں کا شہنشاہ اب ایسا گیا گذرا ہو گیا ہے! کیا اس کے پاس فرشتے نہ تھے جو وہ ایک بشر کو پیامبر بنانے پر مجبور ہو گیا؟ اَبَعَثَ اللّٰهُ بَشَرًا رَّسُوْلًا۔ (بنی اسرائیل) اور اگر تھوڑی دیر کے لیے مان بھی لیا جائے کہ ایک بشر ہی کو یہ خلعت زیبا مرحمت ہونی تھی، تو کیا اس کے لیے بس "حضرت" ہی کی ذات گرامی لائق انتخاب تھی؛ ہم میں سے کوئی اس کا اہل نہ تھا؛ (ءَاُنْزِلَ عَلَيْهِ الذِّكْرُ مِنْۢ بَيْنِنَا. ص) حق تو یہ تھا کہ اس کے لیے طائف یا مکہ کے اعیان واشراف میں سے کسی کو منتخب کیا گیا ہوتا، وہ شاید اس منصب جلیل کا کچھ اہل بھی ہوتا (لَوْلَا نُزِّلَ هٰذَا الْقُرْاٰنُ عَلٰى رَجُلٍ مِّنَ الْقَرْيَتَيْنِ عَظِيْمٍ (سورہ زخرف) لیکن ایسے شخص کا انتخاب تو عجائبات میں سے ہے جس کے پاس نہ دولت ہے نہ سرداری، جو اپنے سودے سلف کے لیے ایک غلام تک نہیں رکھتا (مَالِ هٰذَا الرَّسُوْلِ يَاْكُلُ الطَّعَامَ وَيَمْشِيْ فِي الْاَسْوَاقِ، سورہ فرقان)

اور پھر یہ تو دیکھو! اس شخص کے پیرؤوں کا کیا حال ہے: دعویٰ تو یہ کہ وہی اللہ تعالیٰ کے شکر گذار، حق شناس اور طاعت شعار بندے ہیں، اور

اس لیے وہی محبوب خدا ہیں۔ مگر صورت دیکھیے تو جیسے فلاکت برس رہی ہے، چند لقموں اور چیتھڑوں تک کے لیے ترس رہے ہیں۔

أَلَيْسَ اللّٰهُ بِأَعْلَمَ بِالشَّاكِرِينَ	(انعام)	یا پھر اللہ کو اپنے چہیتوں کی خبر ہی نہیں۔
هٰؤُلَاءِ مَنَّ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ مِنْ بَيْنِنَا۔	(انعام)	کیا حق پرستی اور محبوبیت الٰہی کے علائم یہی ہیں۔

پیغمبر خدا نے فرمایا، اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں، اور جن کو تم فوق البشر قوتوں اور معبودانہ عظمتوں کا حامل سمجھتے ہو وہ سب مجبور محض ہیں" شور اٹھا، کیا یہ عظیم و جلیل ہستیاں عظمت و شان کی اسی سطح پر ہیں جس پر ہم ہیں؟ یہ ان کی شان میں کیسی شدید گستاخی ہے! کیا آج سے معبودان عظام کی یہ پوری بزم برخاست کر دی جائے گی، اور بس ایک ہی معبود رہ جائے گا؟ یا للعجب (أَجَعَلَ الْآلِهَةَ إِلٰهًا وَاحِدًا إِنَّ هٰذَا لَشَيْءٌ عُجَابٌ" (ص)

معلم حق نے شرک کے باطل ہونے پر اس طرح دلائل کے انبار لگا دیے کہ مشرکوں کی زبان استدلال لاکھ کوششوں کے باوجود کھلنے کی جرأت نہ کر سکی مگر ان کی زبان جدال کو کون روک سکتا تھا! انہوں نے کہنا شروع کیا ہم تو اسی راستے پر چل رہے ہیں جس پر اپنے اسلاف و اکابر کو چلتے پایا ہے (إِنَّا وَجَدْنَا آبَاءَنَا عَلَىٰ أُمَّةٍ وَإِنَّا عَلَىٰ آثَارِهِمْ مُقْتَدُونَ" (زخرف)

مطلب یہ تھا کہ آج تو تم یہ فرماتے ہو کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں، مگر ہمارے اسلاف، جن میں فلاں فلاں جیسے مدبر، فلاں فلاں جیسے حکیم، فلاں فلاں جیسے معلمین اخلاق اور فلاں فلاں جیسے ماہرین الٰہیات شامل ہیں، مانتے اور فرماتے رہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے مقربین خاص کو ایک حد تک الوہیت کی بعض صفتوں سے نواز رکھا ہے، اور وہ اللہ کے دربار میں ہمارا ذریعۂ بخشش ہیں، اس لیے ہمیں ان کی پرستش کرنی چاہیے۔ اب اگر تمہاری بات صحیح مان لی جائے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ ہمارے سارے اسلاف احمق تھے، گمراہ تھے اور جہنم کے کندے تھے۔ پس آپ ایک عقل مند اور واقف اسرار حقیقت ہیں!

شارع نے شریعت کے تفصیلی احکام دینے شروع کیے اور پوری انسانی زندگی کو ایک ہمہ گیر ضابطۂ ہدایات کا پابند بنانا شروع کیا، کہا جانے لگا "لو! دین کی ایک نئی قسم ایجاد ہوئی ہے! اب وہ معبدوں اور قربان گاہوں سے نکل کر بازار اور کھیت تک، حتیٰ کہ بیت الخلاء تک جا پہنچا،"

(قَدْ عَلَّمَكُمْ نَبِيُّكُمْ كُلَّ شَيْءٍ حَتَّى الْخِلَاءَةَ ترمذی شریف)

آیت نازل ہوئی کہ مردار حرام ہے، صرف اس حلال جانور کا گوشت کھاؤ جسے تم نے اللہ کا نام لے کر ذبح کیا ہو، فرمایا گیا "کیا خوب! اللہ کا مارا ہوا تو حرام و نجس، مگر اپنا مارا ہوا حلال و طیب!"

تحویلِ قبلہ کا حکم آیا، یہودیوں اور یہودی منافقوں نے آسمان سر پر اٹھالیا، لوگوں سے کہا جانے لگا، "یہ ہیں تمہارے "نبی" جن کا خدا ابھی جگہیں بدلتا رہتا ہے۔ کل تک تو بیت المقدس کی طرف رُخ کرنا ہی دین و ایمان تھا، مگر آج اسکی طرف منہ کرنا حرام ہو گیا۔ یہ ہوا کا رخ دیکھ کر چلنا نہیں تو اور کیا ہے؟ ایک ہی بات ماضی میں فرض، اور حال و مستقبل میں موجب کفر! —— رائے اور فیصلے کی یہ دورنگی بھی خوب ہے"!

ہجرتِ مدینہ سے پہلے مظلوم صحابہ کا ایک گروہ ستم کدۂ مکہ سے حبشہ ہجرت کر جاتا ہے اور وہاں کے بادشاہ، نجاشی، سے پناہ کا طالب ہوتا ہے۔ بزرگانِ قریش اپنے ڈپلومیٹوں کا ایک وفد بھیجتے ہیں، جو شاہی دربار میں حاضر ہو کر مطالبہ کرتا ہے کہ یہ ہمارے بھاگے ہوئے قومی مجرم ہیں، انہیں ہمارے حوالہ کر دیا جائے۔ لیکن بادشاہ تحقیق حال کے بعد یہ مطالبہ منظور کرنے سے انکار کر دیتا ہے۔ وفد مجبور ہو جاتا ہے اور کچھ نئی ترکیبیں سوچتا ہے۔ آخرکار شیطان اس کو ایک "تیر بہدف" تدبیر سجھاتا ہے، چنانچہ وہ اگلے دن پھر حاضر ہوتا ہے اور نجاشی سے کہتا ہے "عزت مآب! ذرا ان سے یہ تو دریافت فرمائیں کہ حضرت عیسی کے بارے میں ان لوگوں کا کیا عقیدہ ہے" بادشاہ مسلمانوں کے سامنے یہ سوال رکھ دیتا ہے مسلمان موقع کی خوفناک نزاکت محسوس کر گئے، وفد بے چینی کے ساتھ اپنے اس کاری داؤں کا نتیجہ دیکھنے کے لیے ہمہ تن چشم و گوش بن

جاتا ہے۔ اسے یقین ہے کہ عیسیٰ کو انہوں نے قرآنی ہدایات کے مطابق عبداللہ ورسولہٗ کہا نہیں کہ عیسائیت کا محافظ نجاشی اپنے مقتدا کی اس توہین پر آگ بگولہ ہو جائے گا اور انہیں بدعقیدہ اور گستاخ قرار دے کر ہمارے حوالہ کر دے گا۔ اور اس میں ذرا شک بھی نہیں کہ شیطانی تدبیر تھی بھی ایسی ہی بے پناہ، یہ دوسری بات ہے کہ اللہ کی نصرت وحمایت نے اسے کامیاب نہ ہونے دیا اور جب حضرت جعفر طیارؓ نے کہا کہ ہم حضرت عیسیٰ کو اللہ کا بندہ اور اس کا رسول سمجھتے ہیں، تو نجاشی نے زمین سے ایک تنکا اٹھایا اور کہا کہ خدا کی قسم عیسیٰ اس سے اس تنکے کے برابر بھی زیادہ نہ تھے۔"

عوام فریب پروپیگنڈوں کی یہ چند مثالیں ہیں۔ نفسیات انسانی کی روشنی میں ان کی سحر کاریوں کا جائزہ لیجیے اور دیکھیے کہ انہوں نے سادہ لوح عوام کی قوت فیصلہ پر کیسا زبردست شب خون مارا ہوگا، اور عوام بھی وہ، جن کے قوائے فکر زنگ خوردہ ہوں، جو دین داری کے سہل ٹوٹکوں کے عادی ہوں، آباؤ اجداد کی عظمت اور تقدس مآبی پر شک کرنا جن کی نگاہوں میں گناہ عظیم ہو، اور جو بالعموم قدامت کے پرستار، اور کسی بھی اصلاح وانقلاب کے طبعی دشمن ہوں —— اور پھر اس کا اندازہ کیجیے کہ نبی اور اس کے ساتھیوں کے دلوں پر کیا بیت جاتی ہوگی جب وہ دیکھتے ہوں گے کہ ان کی گھنٹوں، دنوں اور مہینوں کی داعیانہ مساعی کا حاصل بس ایک چلتے ہوئے فقرے کی نذر

ہو گیا۔ کیا ان کے دلوں کا ٹوٹ ٹوٹ جانا غیر اغلب ہے؟ تجربہ اور مشاہدہ کہتا ہے کہ اغلب کیا معنی، یہ تو یقینی ہے، مگر اللہ تعالیٰ نے کیا فرمایا؟ یہ کہ دلوں کو نہ ٹوٹنے دو، ہمیشہ سے یوں ہی ہوتا آیا ہے اور اب بھی یوں ہی ہوگا۔ صبر کرو اور اپنا کام کیے جاؤ۔ اگر دعوت حق سے تمہیں قلبی تعلق ہے اور چاہتے ہو کہ دوسرے بھی اسے قبول کرلیں تو اس کا ثبوت یہ نہیں کہ ان خونخوار آرائیوں سے دل شکستہ ہو کر بیٹھ جاؤ، تمہارا فرض تو اس پیغام کو دوسروں تک پہنچانا ہے، ان کے دلوں میں اتار دینا نہیں ہے۔ پس یہ طوفانِ مخالفت جہاں اپنے اندر اور بہت سی حکمتیں رکھتا ہے اس کی ایک بہت بڑی حکمت اور مصلحت یہ بھی ہے کہ تمہارے اس تعلق خاطر کو جانچا جائے جو اپنی اس دعوت کے ساتھ تمہیں ہے۔ دراصل تمہارے حالات ان منکرین حق کے لیے وجہ آزمائش ہیں اور ان کے اطوار و افعال تمہارے لیے وجہ آزمائش (وَجَعَلْنَا بَعْضَكُمْ لِبَعْضٍ فِتْنَةً) پس صبر کرو۔ اَتَصْبِرُوْنَ (فرقان)

(۲) طنز و افترا | جب یہ پُرفریب اور عوام کو بھڑکا دینے والے پروپگنڈے ناکام ہوتے نظر آتے ہیں اور ارشاد الٰہی کے مطابق داعی حق اس صورتِ حال کو صبر و سکون سے برداشت کرتے ہوئے اپنی دعوت و تذکیر میں برابر مشغول رہتا ہے، اور پھر اس کی یہ جگرکاویاں ایک ایک دو دو کر کے سنجیدہ و سلیم الطبع انسانوں کو دین کا گرویدہ بناتی رہتی ہیں تو جوشِ

مخالفت اور تیز ہو جاتا ہے اور مذبوحی حرکات شروع ہو جاتی ہیں۔ طعنوں تشنیعوں بہتانوں، افتراپردازیوں، حتیٰ کہ دشنام طرازیوں کا بازار گرم ہو جاتا ہے اور دل آزاری کا کوئی ممکن طریقہ آزمائے جانے سے چھوٹتا نہیں، یہ بھی ان ہی آزمائشی رحلوں میں سے ایک مرحلہ ہے جنہیں اللہ تعالیٰ کی سنتِ ابتلا اہل ایمان کے سامنے لاکر بالقصد پیش کرتی ہے اور جن سے گذرنا مدعیانِ خداپرستی کے لیے ناگزیر ہے۔ چنانچہ قرآن نے اپنے اولین مخاطبوں پر صاف صاف واضح کر دیا تھا کہ:۔

وَلَتَسْمَعُنَّ مِنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا	تمہیں ان لوگوں سے بھی جنہیں تم سے پہلے
الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلِكُمْ وَمِنَ	کتاب دی گئی تھی اور ان سے بھی جو مشرک
الَّذِيْنَ اَشْرَكُوْٓا اَذًى كَثِيْرًا۔	ہیں بہت سی تکلیف دہ باتیں لازماً سننی
(آل عمران)	پڑیں گی۔

آیت کریمہ کے الفاظ سے بس سرسری طور پر نہ گذر جائیے، اس لیے کہ ان میں صرف یہی نہیں بتایا گیا ہے کہ تم مسلمانوں کو ایمان لانے کی پاداش جرم میں برا بھلا کہا جائے گا، بلکہ اس سے زائد ایک اور بھی تلخ حقیقت سے باخبر کر دیا گیا ہے۔ یعنی فرمایا گیا ہے کہ وہ کفار و مشرکین ہی تمہیں کچھ کے نہیں لگائیں گے جو نہیں جانتے کہ وحی و رسالت کیا ہے جنہیں توحید اور جزائے اعمال کی خبر ہی نہیں، جو سمجھتے ہی نہیں کہ تمہاری دعوت کی حقیقت کیا ہے، اور

اس لیے وہ تم سے قطعاً ناواقف ہیں ——— بلکہ ان لوگوں کی زبانیں بھی تمہارے حق میں بچھوؤں کا ڈنک بن جائیں گی جو تم سے خوب واقف ہیں، جو تمہاری دعوت کو یکسر حق سمجھتے ہیں، جن کی نگاہوں میں قرآن کی صداقت ایسی ہی روشن ہے جیسے دوپہر کا سورج، جو نبی کو اسی طرح اللہ کا نبی ——— نبی موعود و رسول مطلوب ——— جانتے پہچانتے ہیں جس طرح کوئی سینکڑوں کے مجمع میں اپنے بیٹے کو پہچان لیا کرتا ہے (یَعْرِفُوْنَہٗ کَمَا یَعْرِفُوْنَ اَبْنَآءَھُمْ) جو وحی و رسالت سے واقف، توحید و معاد سے واقف، ایمان و اسلام سے واقف، دین و خدا پرستی سے واقف، قرآن و نبی سے واقف، تم سے اور تمہاری دعوت، سب سے واقف ہیں، مگر یاد رکھو ان سب واقفیتوں کے باوجود وہ تمہارے حق میں سب سے بڑے ناواقف ثابت ہوں گے۔ وہ مشرکوں اور کافروں اور دہریوں کو برداشت کر لیں گے، مگر تمہیں برداشت نہیں کریں گے، وہ ان کے کفر و شرک اور الحاد کو تمہارے ایمان و اسلام پر ترجیح دیں گے۔ وہ کہیں گے کہ تم نام نہاد اہل ایمان سے تو یہ اہل کفر ہی زیادہ اچھے اور ہدایت شناس ہیں (یَقُوْلُوْنَ لِلَّذِیْنَ کَفَرُوْا ھٰٓؤُلَآءِ اَھْدٰی مِنَ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا سَبِیْلًا۔ نساء) کفار و مشرکین تو زیادہ سے زیادہ یہ کریں گے کہ تمہیں احمق اور دیوانہ ٹھیرائیں گے، تمہارے نبی کو شاعر و مجنون اور ساحر و کاہن کہیں گے، چشم و ابرو سے تم پر معترضانہ اشارے کریں گے اور کچھ پھبتیاں کسیں گے

مگر یہ اہل کتاب یہ کتاب الٰہی کے علماء لمبے لمبے چغے زیب تن کیے اور بڑی بڑی تسبیحیں لٹکائے آئیں گے اور اللہ کے نام پر، اس کی شریعت کی سند کے ساتھ، پوری تقدس تابی کی شان میں تمہاری بدعقیدگی کا اعلان فرمائیں گے تمہیں جاہل ٹھیرائیں گے، تمہارے پیغمبر تک کو خودغرض، مفادپرست، کان کا کچا (اُذُنٌ) اور ایک معمولی گڈریا (رَاعِینَا) کہیں گے۔ ارشاد ہوگا کہ خدا کی شان! اب اُمیوں یعنی اجڈ گنواروں اور "اچھوتوں" کا یہ گروہ (بنی اسمٰعیل) بھی دینی پیشوائی کا خواب دیکھ رہا ہے"۔ —— پس یہ تو نہیں کہا جاتا کہ ان کے ان دل دوز فقروں سے تمہیں ملول خاطر نہ ہونا چاہیے، اس لیے کہ ایسا ہونا بہرحال تقاضائے بشریت ہے، اور یوں تو ہر بیجا مخالفت قلق انگیز ہوتی ہے، مگر وہ مخالفت جو "اپنوں" اور واقف کاروں کی طرف سے ہوتی ہے، دلوں کو خون کر دیتی ہے، اور ان کے ہاتھوں سے پھینک مارا ہوا ایک پھول سینے میں جو گھاؤ ڈال دیتا ہے وہ بےخبروں اور ناواقفوں کا پتھر بھی نہیں ڈال سکتا، اس لیے تمہارا غمگین ہونا قدرتی بات ہے۔ (قَدْ نَعْلَمُ اِنَّهٗ لَيَحْزُنُكَ الَّذِيْ يَقُوْلُوْنَ انعام) لیکن یہ ضرور یاد رکھو کہ یہ نہ خلاف توقع ہے نہ بلاوجہ، اور یہ بھی تمہارے ادائے فرض کے احساس کو آزمانے کے لیے اور اس کو مزید ترقی دینے کے لیے ہے۔ پس مخالفین کے اس وار کو بھی خالی دے دو اور صبر و سکون سے اپنا فرض منصبی پورا کرتے رہو، یہ نہ دیکھو کہ کون کیا کہہ رہا ہے۔

یہی عزیمت ایمانی کا تقاضا ہے۔ وَاِنْ تَصْبِرُوْا وَتَتَّقُوْا فَاِنَّ ذٰلِكَ مِنْ عَزْمِ الْاُمُوْرِ (نساء)

(۳) نقصان جان و مال

اس کے بعد مخالفت کا زور اور بڑھ چلتا ہے اور جوشِ عناد جنون کی حد تک جا پہنچتا ہے،

نوکِ زبان کی بجائے نوکِ شمشیر کے وار شروع ہو جاتے ہیں، ابتلائے ایمانی کا آخری دور آجاتا ہے۔ آ نہیں جاتا بلکہ سنتِ الٰہی کے مطابق لایا جاتا ہے، اور کہا جاتا ہے کہ دین سے تعلق کی استواری کا مزید ثبوت مہیا کرو، آخری اور انتہائی ثبوت، یعنی اپنے مالی اور جانی مفادوں سے یک قلم دست بردار ہو جاؤ۔ چونکہ تم نے اللہ کی بندگی کا دعویٰ کیا ہے اور اس کی رضا کے لیے سب کچھ قربان کر دینے کا قول دیا ہے، اس لیے وہ دیکھنا چاہتا ہے کہ کیا واقعی تم اپنے دعوے کے سچے اور قول کے پکے ہو؟ اس غرض کے لیے وہ ایسے حالات پیدا کرے گا جن میں تمہاری کھیتیاں تباہ ہو جائیں گی، تمہاری تجارتیں ٹھپ ہو جائیں گی، تمہاری جائدادوں کو نقصان پہنچے گا۔ نیز اس مقصد کی خاطر وہ تم سے اس طرح کے مطالبات کرے گا جن سے اپنے کتنے ہی رشتہ ہائے قرابت پر تمہیں قینچی چلا دینی پڑے گی اپنے دین کی حفاظت و نصرت کے لیے تم سے اپنی گاڑھی کمائی خرچ کر دینے کو کہے گا اور تمہیں بغیر کسی خواہش تحسین و نمود کے اپنی پونجیاں نثار کر دینی پڑیں گی۔ اور پھر آخر میں تم سے وہ تمہاری

گردنیں بھی طلب کرے گا جنہیں راہِ حق میں پیش کر کے تمہیں بندگیٔ حق کی آخری شہادت بھی دینی ہوگی۔

لَتُبْلَوُنَّ فِیْٓ اَمْوَالِکُمْ وَ اَنْفُسِکُمْ (آل عمران) تم کو ضرور بالضرور مال اور جان کی آزمائشوں میں ڈالا جائے گا۔

یوں نہیں فرمایا گیا کہ اگر تم پر جانی اور مالی مصیبتیں آ پڑیں تو صبر کرنا بلکہ یہ کہا گیا کہ یہ مصیبتیں تم پر لازماً پڑیں گی، پڑیں گی ہی نہیں بلکہ تم پر ڈالی جائیں گی اور ڈالنے والا خود میں ہوں۔ جیسا کہ سورۂ بقرہ میں فرمایا گیا ہے کہ: لَنَبْلُوَنَّکُمْ الخ (ہم تمہیں جانی اور مالی آزمائشوں میں ضرور ڈالیں گے)

(۴) محبوب رجحانات کی قربانی

یہ آزمائشیں تو وہ ہیں جن کا تعلق خارج سے ہے، اور جو مخالفین اسلام کی طرف سے پیش آتی ہیں۔ لیکن اہل ایمان کو ان کے ساتھ ایک اور آزمائش سے بھی دوچار ہونا پڑتا ہے جس کا تعلق خود انسان کے اپنے ذاتی تصورات اور طبعی میلانات سے ہے، اور جس کا صدور اعدائے دین کی طرف سے نہیں بلکہ احکام دین کی طرف سے ہوا کرتا ہے۔

اس اجمال کی شرح یہ ہے کہ ہر انسان کے کچھ مخصوص میلانات ہوتے ہیں۔ ان میں سے بیشتر تو قومی روایات اور ملّی رسوم کی پیداوار ہوتے ہیں اور کچھ اس کی اپنی ذاتی اُفتادِ طبع کا نتیجہ ہوتے ہیں۔ ان تصورات اور میلانات

لِيُضِيعَ إِيمَانَكُمْ إِنَّ اللّٰهَ بِالنَّاسِ لَرَؤُوفٌ رَّحِيمٌ۔ (بقرہ)

سوا جنہیں اللہ تعالیٰ نے واقعی ہدایت دے رکھی ہے، اور ان کے لیے یہ تحویل قبلہ کی آزمائش بڑی ہی شاق تھی۔ مگر یقین رکھو، اللہ ایسا نہیں ہے کہ وہ تمہارے ایمان کو ضائع کرے۔ وہ تو انسانوں کے حق میں بڑا ہی شفیق اور مہربان ہے۔

اس جواب سے یہ بات بالکل واضح ہے کہ شروع ہی سے خانہ کعبہ کا قبلہ نہ قرار دیا جانا صرف مصلحت ابتلاء کے پیش نظر تھا۔ اللہ تعالیٰ اگر چاہتا تو اول روز ہی یہ حکم دے دیتا، مگر اس نے ایک خاص مدت تک اس کو ملتوی رکھا، تاکہ وقت پر اس سے ایک اہم دینی مصلحت پوری ہو، اور یہ کھل کر سامنے آجائے کہ کون اپنے اندر ایمان کا سچا جوہر رکھتا ہے اور کون اس سے بے بہرہ ہے؟ کون قرآن اور صاحب قرآن کی بلا قید و شرط پیروی کرتا ہے اور کون اس کامل خود سپردگی کے لیے تیار نہیں ہے؟ کون رضائے الٰہی کے لیے اپنے ایک ایک رجحان طبع کو قربان کرسکتا ہے اور کون ہے جو اپنے ذوق پر دینی تقاضوں کو ترجیح دینے کے لیے تیار نہیں، اور جس کا احساس باطن احکام شرع پر عمل کرنے سے پہلے اپنے کچھ مخصوص تصورات اور جذبات کی طرف سے اجازت کا ملنا ضروری سمجھتا ہے؟ گویا صدق ایمانی کی جانچ حکیم مطلق کی نگاہوں میں اتنی اہم دینی ضرورت ہے کہ اس کے لیے اصل قبلہ کے اعلان کو بھی ایک عرصہ تک ملتوی رکھا گیا۔

یہ ہیں اخلاص ایمانی کے جانچنے کے لیے آزمائشی صورتیں اور تدبیریں، جن کو سنتِ خداوندی اختیار کرتی رہی ہے۔ ان کی ہمہ جہتی پر غور کیجیے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ آزمائشیں نہیں ہیں بلکہ ایکسرے کی کوئی کامیاب مشین ہے جو ایک ایک مدعی ایمان کی پوری تصویر ایمانی کا بالکل ٹھیک ٹھیک عکس لے لیتی ہے، اور اللہ جل شانہٗ کسی مومن کو سندِ ایمان عطا فرماتے ہوئے اس کے دل کے گوشے گوشے کو ایک ایک کھوٹ سے فی الجملہ پاک دیکھنا چاہتا ہے۔ اس کے لیے وہ مشکلات و مصائب اور ناگوار حالات و مطالبات کی ایسی بھٹی تیار کر دیتا ہے جس میں جل کر یا تو ایمان کا "سکہ زریں" سیاہ پڑ جائے اور دنیا کو معلوم ہو جائے کہ اس کی صرف شکل اور بیرونی سطح سونے کی سی چمکدار تھی ورنہ حقیقت میں اندر کھوٹ ہی کھوٹ تھا، یا پھر اس بھٹی میں تپ کر یہ سکہ کھرا اور سُرخ نکل آئے اور بتا دے کہ اس کے اندر بھی زر خالص ہی تھا جیسا کہ اوپر سے معلوم ہو رہا تھا، یا اگر اس میں کچھ میل کچیل شامل ہے تو ابتلاؤں کی اس کڑی آنچ میں جل کر ختم ہو جائے اور اس حد تک خالص سونا بن جائے جس حد تک خالص سونے کی اللہ کے دین کو ضرورت ہے اور جس سے دنیا و آخرت کی سعادتیں خریدی جا سکتی ہیں۔

فکر ایمانی کا امتیاز

یہ نہ سمجھئے کہ ان ابتلاؤں کے ذریعہ سچے یا جھوٹے اہل ایمان میں صرف عملاً ہی امتیاز ہوتا ہے اور

ایک مدعی ایمان کا اخلاص یا نفاق صرف میدانِ عمل ہی میں آشکارا ہوتا ہے۔ نہیں، یہ فرق ان دونوں کے اندازِ فکر میں بھی ٹھیک اسی شان سے نمایاں ہوتا ہے۔ صادق الایمان ان آزمائشوں کو اپنی منزلِ مقصود کے لازمی مراحل سمجھتے ہیں، ان کو اپنی توقع کے عین مطابق قرار دیتے ہیں، اور پھر ان کا مردانہ وار مقابلہ کرتے ہیں۔ وہ سمجھتے ہیں کہ یہی تو امتحان کا وہ "پرچہ" ہے جو ہمارے ایمانی دعویٰ کو جانچنے کے لیے ہمارے ہاتھوں میں دیا گیا ہے اور اسی کے "حل" پر ہماری کامیابی یا ناکامیابی کا فیصلہ موقوف ہے۔ ان کا یہی اندازِ فکر تھا جس کا انہوں نے غزوہ خندق کے زلزلہ افگن اور ہوش ربا حالات میں مظاہرہ کیا تھا، جب ہر چہار طرف سے دشمنوں کے جتھے کے جتھے چلے آ رہے تھے مگر ان کی زبانوں پر یہ صبر آموز کلمات جاری تھے۔

هٰذَا مَا وَعَدَنَا اللّٰهُ وَ	یہ تو وہی چیز ہے جس کا اللہ اور اس
رَسُوْلُهٗ وَصَدَقَ اللّٰهُ وَ	کے رسول نے ہم سے وعدہ کیا تھا۔
رَسُوْلُهٗ (احزاب)	سچا ہے اللہ اور اس کا رسول۔

اور انجام کار مصائب کی یہی بارش ان کی کشتِ ایمانی کے لیے آبِ رحمت بن گئی وَمَا زَادَهُمْ اِلَّآ اِيْمَانًا وَّتَسْلِيْمًا۔

مگر جھوٹوں کا یعنی ان کا جو دین کے مطالبوں اور تقاضوں پر اپنے مادی مفادات کو یا اپنے محبوب تصورات اور میلانات کو قربان کرنے کی جرأت

نہیں رکھتے اور جن کو ایمان کے خوش آیند حقوق تو ہمیشہ یاد رہتے ہیں مگر اس کی تلخ ذمہ داریاں سدا بھولی رہتی ہیں، کیا حال ہوتا ہے؟ ان کا حال یہ ہوتا ہے کہ اوّل اوّل ان پر ایک ناگہانی دہشت طاری ہوتی ہے، وہ گھور گھور کر مشکلات کے طوفانوں کو دیکھتے ہیں اور اچنبھے سے کہتے ہیں کہ ہیں! ہم مومن اور اس کے لیے یہ آفتیں! کیا یہی وہ وعدۂ حسنیٰ ہے جس کا بار بار اعلان ہوتا رہا ہے؟ عزت و اقبال اور فتح و شادکامی اسی کا نام ہے؟ کیسا عجیب دھوکا تھا جو ہمیں دیا گیا! وَمَا وَعَدَنَا اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗٓ اِلَّا غُرُوْرًا (احزاب) پھر جب قربانیوں کا باقاعدہ اور براہ راست مطالبہ شروع ہو جاتا ہے تو معذرتوں اور حیلوں بہانوں کی پناہ لینے لپک پڑتے ہیں اور "کتاب الحیل" کی ورق گردانی شروع کر دیتے ہیں، جہاں انہیں ملتا ہے کہ ایسے مواقع پر خاموش ہو جاؤ، کیونکہ قرآن حکیم کا ارشاد ہے لَا تُلْقُوْا بِاَيْدِيْكُمْ اِلَى التَّهْلُكَةِ (بقرہ) جس کا مطلب ہی یہ ہے کہ اس طرح کی مصیبتوں سے بچ کر نکل جاؤ۔ دین تو آسان ہے وَمَا يُرِيْدُ اللّٰهُ لِيَجْعَلَ عَلَيْكُمْ فِي الدِّيْنِ مِنْ حَرَجٍ (مائدہ) اور اس سے بڑی تنگی اور مشکل کیا ہوگی کہ انسان کی جان و مال کے لالے پڑ جائیں۔ اور وہ ساری دنیا کا نشانۂ عداوت بن کر رہ جائے"۔ اس پر اگر ان کی غلط اندیشی یا خود فریبی کا پردہ چاک کر دیجیے اور ان کے لیے قربانی کے قرآنی مطالبوں پر زور دیجیے، تو کہتے ہیں: "یہ صحیح ہے کہ دین کے لیے ہمیں جان و

مال سے جد وجہد کرنے کے لیے کہا گیا ہے، مگر یہ بھی تو دین ہی کی بخشی ہوئی "اماں" ہے کہ کسی شخص پر اس کی وسعت سے زیادہ ذمہ داری نہیں۔ (لَا یُکَلِّفُ اللّٰہُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا۔ بقرہ) اور جب ایسا ہے تو اس کا فیصلہ ہم میں سے ہر شخص اپنی بابت خود ہی کر سکتا ہے کہ وہ کتنی وسعت اور طاقت رکھتا ہے، نہ کہ کوئی دوسرا۔ لہٰذا ہمیں تو فی الحال معذور ہی سمجھو، کیونکہ ہم موجودہ مشکلات سے عہدہ برآ ہونے کی اپنے اندر کوئی سکت نہیں پاتے اور اس عدم استطاعت کے باوجود اگر تم ہمیں اس سخت مجاہدے کے لیے مجبور کرتے ہو تو اس کا مطلب یہ ہے کہ بلا وجہ ہمیں ضغطے میں مبتلا کرنا چاہتے ہو، اور ہم پر وہ بوجھ لادنے پر مصر ہو جو فی الواقع ہم پر ڈالا نہیں گیا ہے۔ غزوۂ تبوک میں اسی ذہنیت کا مظاہرہ کیا گیا جب باہم یہ مشورے دیئے گئے کہ لَا تَنْفِرُوْا فِی الْحَرِّ (اتنی شدید گرمی میں نہ نکلو) اور جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے اس طرح کے ایک صاحب آگئے اور ان سے میدان جہاد کی طرف چلنے کے لیے کہا گیا تو جواب دیا گیا لَا تَفْتِنِّیْ، مجھے اس فتنہ میں نہ ڈالیے، یہ میری قوت برداشت اور وسعتِ نفس سے باہر ہے، میں اس مصیبت کو جھیل نہیں سکتا۔"

پھر جب یہ اندازِ فکر اور پختہ ہو جاتا ہے تو مشکلات و مصائب کے مقابلے سے نہیں بلکہ نفس مشکلات ہی سے انکار کر دیا جاتا ہے۔ کہا جاتا

ہے کہ "ہر طرف تو امن ہی امن ہے، ہم پورے اطمینان کے ساتھ اپنے دین کی پیروی کر رہے ہیں، آخر تم ہمیں کن مفروضہ محاذوں کے لیے للکار رہے ہو؟ کیا ہم ہوا سے لڑیں؟ تم خواہ مخواہ ہر طرف خطرات ہی خطرات دیکھتے رہتے ہو اور ہر آن تمہارے کانوں میں دینی جد و جہد کی صدائیں ہی آتی رہتی ہیں۔ غور فرمایئے کیسا تیر بہدف اور طلسماتی نسخہ ہے حل مشکلات کا!

قصہ کوتہ گشت ورنہ دردسر بسیار بود

اسی طرز فکر کے ائمہ تھے جنہوں نے غزوۂ احد کے موقع پر جہاد کے لیے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی نفیر عام کے باوجود کہا تھا۔

لَوْ نَعْلَمُ قِتَالًا لَّاتَّبَعْنَاكُمْ — اگر ہم محسوس کرتے کہ لڑائی (واقعی) ہونے والی ہے تو تمہارے ساتھ ضرور ہو لیتے۔ (آل عمران)

حالانکہ لشکر قریش مدینہ کے دروازوں پر کھڑا دعوت پیکار دے رہا تھا۔

قانون آزمائش کے نفاذ کا تسلسل

اللہ تعالیٰ کی یہ سنت ابتلاء جس طرح ہمہ جہتی ہوتی ہے اسی طرح ہمہ گیر بھی ہوتی ہے، اور کسی نبی کی دعوت نہیں جس کے ساتھ اس سنت کا نفاذ نہ ہوا ہو۔ اجمالاً اتنی بات ہر شخص جانتا ہے، کیونکہ قرآن میں اس امر کی ایک سے زائد مقامات پر صراحتیں موجود ہیں۔ لیکن اس سنت کا تعلق بعد کے زمانوں سے، بالخصوص ہمارے اپنے زمانے سے کیا ہے؟ یہ

سوال بہت کم ذہنوں میں آتا ہے۔ انسان اپنے آپ کو مراعاتیں دینے میں پیدائشی طور پر بڑا ہی فراخ دل واقع ہوا ہے، اس لیے اس "بے فکری" پر ہمیں کوئی خاص تعجب نہیں، اگرچہ اس بے فکری کے نتائج اتنے ہولناک ہیں کہ ان کی نظیر ملنی دشوار ہے۔ لوگ جب قرآن میں اس طرح کی آیات پڑھتے ہیں کہ:-

الَّذِيْنَ اسْتَجَابُوْا لِلّٰهِ وَالرَّسُوْلِ مِنْ بَعْدِ مَا اَصَابَهُمُ الْقَرْحُ لِلَّذِيْنَ اَحْسَنُوْا مِنْهُمْ وَاتَّقَوْا اَجْرٌ عَظِيْمٌ الَّذِيْنَ قَالَ لَهُمُ النَّاسُ اِنَّ النَّاسَ قَدْ جَمَعُوْا لَكُمْ فَاخْشَوْهُمْ فَزَادَهُمْ اِيْمَانًا وَّقَالُوْا حَسْبُنَا اللّٰهُ وَنِعْمَ الْوَكِيْلُ۔
(آل عمران)

جن (اصحاب رسول) نے اللہ اور اس کے رسول کی پکار پر لبیک کہی (اور جنگ کے لیے تیار ہو گئے) حالانکہ (ابھی ابھی لڑائی کا) زخم کھا چکے تھے، تو ان میں جو محسن اور متقی ہیں ان کے لیے بڑا اجر ہے جن کا حال یہ ہے کہ جب لوگوں نے انہیں خبر دی کہ دشمن نے (تم پر حملے کے لیے بڑی بھاری جمعیت) اکٹھا کی ہے۔ پس ڈرو (ان کے مقابلے سے)، تو یہ سن کر ان کا ایمان اور بڑھ گیا اور وہ بول اٹھے "اللہ ہمارے لیے کافی ہے اور بہترین کارساز ہے۔"

نیز:-

لَمَّا رَاَى الْمُؤْمِنُوْنَ

جب مسلمانوں نے دشمن گروہوں کو دیکھا تو

الاَحْزَابَ قَالُوا هٰذَا مَا وَعَدَنَا اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ ... . مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ رِجَالٌ صَدَقُوْا مَا عَاهَدُوا اللّٰهَ عَلَيْهِ فَمِنْهُمْ مَنْ قَضٰى نَحْبَهٗ وَمِنْهُمْ مَنْ يَّنْتَظِرُ۔ (احزاب)

کہا یہ وہی چیز ہے جس کا اللہ اور رسول نے ہم سے وعدہ کیا تھا...... مومنوں میں ایسے لوگ ہیں جنہوں نے اپنے اس عہد کو سچا کر دکھایا جو انہوں نے اللہ سے باندھا تھا۔ چنانچہ ان میں سے کتنوں ہی نے اپنی نذر پوری کر دی اور کچھ ابھی وقت کے منتظر ہیں۔

تو ان پاک نفسوں کو ان کی استقامت ایمانی پر جی کھول کر ہدیۂ عقیدت پیش کرتے ہیں، اور پیش کر کے آگے بڑھ جاتے ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس طرح کی آیتوں میں خود ان کے اپنے لیے کوئی درس ہدایت نہیں۔ بلکہ کچھ بعید نہیں اگر وہ دل ہی دل میں اللہ کا شکر ادا کر جاتے ہوں کہ ہم اس بھاری آزمائش سے محفوظ رکھے گئے ہیں۔ اگر ایسا ہے تو بڑی شدید غلط فہمی بلکہ ایک تباہ کن خوش گمانی ہے۔ ان لوگوں نے اس حقیقت پر غور نہیں کیا کہ قانون ابتلاء کا اصل تعلق نہ نبوت اور بعثت سے ہے، نہ ہی رفاقت نبوی سے، بلکہ ادعائے ایمان سے ہے قرآن یہ نہیں کہتا کہ نبی کی رفاقت کا امتحان لیا جانا ضروری ہے، بلکہ یہ کہتا ہے کہ دعوت نبوی پر ایمان لانے کا دعویٰ پرکھا جانا ضروری ہے اَحَسِبَ النَّاسُ اَنْ يُّتْرَكُوْٓا اَنْ يَّقُوْلُوْٓا اٰمَنَّا وَهُمْ لَا يُفْتَنُوْنَ کے الفاظ ابھی گذر چکے ہیں اسی طرح کے جملے آپ کو

اور سورتوں میں بھی ملیں گے، مثلاً:۔

اَمْ حَسِبْتُمْ اَنْ تَدْخُلُوا الْجَنَّةَ وَلَمَّا يَعْلَمِ اللّٰهُ الَّذِيْنَ جَاهَدُوْا مِنْكُمْ وَيَعْلَمَ الصَّابِرِيْنَ۔ (سورۂ آل عمران ۱۴۲)	کیا تم نے سمجھ رکھا تھا کہ (محض ایمان کا دعویٰ کر کے) جنت میں داخل ہو گے؛ حالانکہ ابھی تو اللہ نے جانا ہی نہیں کہ تم میں کون ہیں جنہوں نے (حق کے لیے) اپنی پوری جدوجہد کر ڈالی اور کون ہیں جو راہِ حق پر ہر حال میں اٹھنے والے ہیں؛
وَلَيَعْلَمَنَّ اللّٰهُ الَّذِيْنَ آمَنُوْا وَلَيَعْلَمَنَّ الْمُنَافِقِيْنَ۔ (عنکبوت)	اور اللہ (آزمائشوں کے ذریعہ) یہ جان کر رہے گا کہ کون (واقعی) صاحب ایمان ہے اور کون منافق ہے۔

ہر صاحب نظر دیکھ سکتا ہے کہ اس طرح کی آیتوں میں جس شے کو اللہ تعالیٰ نے وجہِ امتحان بلکہ موردِ امتحان قرار دیا ہے وہ ایمان کا قول اور دعویٰ ہے، نبی کی مصاحبت نہیں ہے، وہ کہتا ہے کہ جنت کا ملنا ایمان پہ، اور خود ایمان کا ایمان ہونا راہِ حق کے مجاہدات اور صبر و ثبات پر منحصر ہے، وہ یہ نہیں کہتا کہ جنت کا حصول نبی کی رفاقت اور ہم نشینی پر منحصر ہے۔ اس کا یہ اعلان کہ "وہ جان کر رہے گا کون مومن ہے اور کون منافق" اس بات کا کھلا ثبوت ہے کہ آزمائش کا مبنیٰ نفسِ دعوائے ایمان ہے اور دعوائے ایمان کا سچّا قرار پانا مقتضیاتِ ایمانی پر موقوف ہے، ورنہ جہاں تک جاننے کا تعلق

ہے کیا چیز ہے جو اللہ کے علم میں نہیں۔

قرآن کی ان تصریحات سے اس بے بنیاد نظریے کا کوئی موقع باقی نہیں رہتا کہ اللہ تعالیٰ کا قانونِ آزمائش صرف اصحابِ نبی سے تعلق رکھتا ہے، عام اہلِ ایمان پر اس کا نہ اطلاق ہوتا ہے نہ نفاذ۔ صاف نظر آتا ہے کہ یہ ایک سراسر مہمل نظریہ ہے، نظریہ نہیں بلکہ نفس کی ایک خواہش ہے جس نے تصور اور نظریہ کا لبادہ اوڑھ لیا ہے، اگر آزمائے جانے کی چیز رفاقتِ نبوی اور صحابیت ہوتی تو لاریب یہ خیال بھی خواہش نہیں نظریہ ہوتا، اور نظریہ بھی نہیں بلکہ حقیقت ہوتا، لیکن بنائے آزمائش جب نفس دعوائے ایمان ہے تو جس طرح دورِ نبوت کے لوگوں کا ادعائے ایمان اس قانونِ ابتلا کے نفاذ کو ضروری قرار دیتا ہے، کوئی وجہ نہیں کہ ٹھیک اسی طرح دوسرے زمانوں میں بھی یہ قانون حرکت میں نہ رہے اور اللہ تعالیٰ مدعیانِ ایمان کے جوہرِ ایمانی کو نہ جانچے۔ البتہ وہ عادل و حکیم اس فرق کو نظر انداز نہیں کر سکتا جو ان دونوں زمانوں میں پایا جاتا ہے۔ اصحابِ انبیاء کے لیے نصرت و تائید اور تقویتِ قلب کے جو اسباب عالمِ ظاہر میں بھی موجود ہوتے ہیں وہ ہم کم نصیبوں کو کہاں نصیب؟ اس لیے ان ابتلاؤں میں جو شدت ان حضرات کے لیے ہوتی رہی ہے، وہ دوسروں کے لیے یقیناً نہیں ہو سکتی، کیونکہ اللہ کا دستور ہے کسی شخص یا گروہ پر اس کی قوتِ واقعی سے زیادہ بوجھ نہیں ڈالتا۔

غرض جو شخص دین و ایمان کا نام لیتا ہے اسے چاہیے کہ مخالفتوں اور مصیبتوں کے لیے اپنے دل کو مضبوط رکھے، اپنے خطرناک موقف کے بارے میں کسی خوش گمانی کا شکار نہ ہو، یقین رکھے کہ میں ایک بڑی آزمائش گاہ میں اترا ہوا ہوں اور اللہ تعالیٰ کا قانون ابتلا بدستور میرے لیے بھی مصروف عمل ہے، ختم نبوت کے ساتھ وہ بھی منسوخ نہیں ہو گیا ہے۔ یہ صحیح ہے کہ اسے آزمائشوں کو دعوت نہیں دینی چاہیے کہ یہ بڑی جسارت کا کام ہے اور شرعاً ممنوع، لیکن جو آزمائشیں خود بخود راہ روک کر سامنے آ کھڑی ہوتی ہیں ان سے تو اسے ہم نبرد ہونا ہی پڑے گا۔ ان سے کترا کر نکل جانا دراصل اس شرط کو تسلیم کرنے سے انکار کرنا ہے جسے پورا کرائے بغیر قدرت درِ جنت کھولنے پر تیار نہیں۔ یہی تو امتحان کا وہ پرچہ ہے جو ہمارے آپ کے ادعائے ایمانی کی جانچ کے لیے ہمارے ہاتھوں میں دیا جاتا ہے اور جو ہمیشہ دین حق سے رشتہ جوڑنے والوں کے ہاتھوں میں دیا جاتا رہا ہے۔ اس سے کترانے سے نہ کوئی فائدہ ہے، نہ آنکھیں میچ لینے سے فی الواقع وہ معدوم ہی ہو جائے گا۔

آپ پوچھیں گے کہ زمانۂ نبوت میں یہ آزمائشیں تو وحی کی معرفت یا نبی کے ذریعہ متعین شکل میں لوگوں کے سامنے آجایا کرتی تھیں، مگر آج تو زبانِ وحی بھی خاموش ہے اور ذریعہ نبوت بھی ناموجود، پھر ہمیں کون

بتائیے کہ ہماری کن باتوں سے آزمائش ہو رہی ہے؟ مگر شاید آپ کو یاد نہیں رہا کہ ایک اسی چیز پر کیا موقوف ہے، دین کے بیشتر احکام و مطالبات کا حال بھی تو یہی ہے۔ زمانۂ رسالت میں ہر شخص کسی بھی حکم شرعی کے لیے درس گاہ نبوی میں جا حاضر ہوتا، مگر آج ہمیں اور آپ کو یہ سعادت تو نصیب نہیں۔ پھر کیا ان سارے احکام و مقتضیات دین کے لیے ہم اپنے آپ کو غیر مکلف قرار دے لیں؟ اگر دین کے باقی احکام و ہدایات میں یہ رویہ صحیح نہیں، اور پیروی دین کا سچا جذبہ رکھنے والے کے لیے راہِ عمل معلوم کرنے میں کوئی دشواری نہیں، تو اسی ایک معاملہ میں کوئی ناقابل حل دشواری کیوں پیش آنے لگی۔ آپ کے سامنے دین کی حقیقت، اس کے تقاضے، اس کی شاہراہِ عمل، نبی کا اسوہ اور اپنی زندگی کا نصب العین، سب کچھ موجود ہے۔

جس دم آپ نے پورے اخلاص کے ساتھ اللہ کی اس زمین پر اپنی جگہ متعین کر لی اور اپنے مقصدیات کو نگاہوں کے سامنے رکھ لیا، اسی دم آپ کے سامنے عمل کی شاہراہ باز ہو جائے گی، آپ قدم اٹھاتے جائیں گے اور قرآنی ہدایات آپ کی سمت سفر متعین کرتی جائیں گی، نبی کا اسوہ روشنی کا منارہ بن کر اس کے ایک ایک نشیب و فراز کو اجاگر کرتا جائے گا۔

آپ جب یہ عزم بندگی لے کر اٹھیں گے تو اللہ تعالیٰ کی سنت ابتلا بھی معاً اپنا کام شروع کر دے گی۔ پھر جوں جوں آپ آگے بڑھتے جائیں گے، موانع

خود بخود آپ کا استقبال کریں گے، وہ اپنا تعارف آپ کرائیں گے، آپ کو ان کے پہچاننے کے لیے کسی کاوش کی ضرورت نہیں پڑے گی، ان کا نام تو ان کی پیشانیوں پر لکھا ہوگا، جنہیں آپ نظر ڈالتے ہی پڑھ لیں گے، بشرطیکہ آپ خود ایسا چاہیں اور دانستہ آنکھیں نہ بند کرلیں۔

مثلاً قرآن آپ کو بتاتا ہے کہ "اصل حق، توحید ربوبیت اور توحید الوہیت ہے، اور تمہاری زندگی کامیاب اُسی وقت ہو سکتی ہے جب تم اسی اصل پر اس کی بنیادیں استوار کرو، اللہ کے سوا کسی کو اپنی حقیقی عقیدتوں محبتوں، پرستشوں اور طاعتوں کا مرکز نہ بناؤ، کسی کو اپنا اصل فرمان روا نہ مانو، کسی کو اپنی زندگی کا شارع و قانون ساز نہ تسلیم کرو، اور صرف اتنا ہی نہیں کہ تسلیم نہ کرو، بلکہ اسی بنائے حق پر اپنی زندگی کی پوری عمارت تعمیر کرنے کی کوشش کرو، اور پھر ساری دُنیا کو اسی کی دعوت دو، تلقین کرو، اور اسی مقصد کے لیے اپنی جانیں کھپا دو" جب آپ اس حکم قرآنی کو سُن کر دُنیائے عمل کی طرف رُخ کریں گے تو دیکھیں گے کہ یہاں کا تو پورا نقشہ ہی الٹا ہے، اور انسانی زندگی کے ضابطۂ حیات میں اس اصل اصیل کا دور دور تک کہیں سُراغ نہیں ملتا۔ یہ دیکھ کر آپ کا ایمان باللہ آپ کو اس ظلم عظیم کے خلاف آواز اٹھانے اور عملی اقدام کے لیے مجبور کرے گا، آپ خود ایسی تمام ارادی حرکتوں سے تاحدِّ امکان بچیں گے جو توحید کے ان بنیادی تصوّرات سے متصادم ہوتی ہوں،

اور عہد بندگی کا حق ادا کرنے کے لیے ضروری سمجھیں گے کہ دوسروں کو بھی ان سے روکیں۔ لیکن اللہ تعالیٰ کی سنّت ابتلاء کا فوراً اشارہ ہو گا اور قوم و ملت کے مصالح آپ کے خلاف مقدس جہاد شروع کر دیں گے، اور کیا بتائیں کہ اس مقدس جہاد کا علم کیسے کیسے تقدس مآب ہاتھوں میں ہو گا۔ عوام کو یہ کہہ کر اکسا دیا جائے گا کہ یہ تمہیں زندہ درگور کر دینا چاہتا ہے۔ "قیصر" کو یہ کہہ کر بھڑکایا جائے گا کہ یہ حضور کو "خراج" ادا کرنے سے روکتا ہے۔ اور اس پر بھی اگر آپ کا ہوش "حماقت" مانند نہ پڑا تو آپ کو حدود دین سے خارج کر دیا جائے گا، یا اگر کچھ رعایت روا رکھی بھی گئی تو کم از کم دین اور اسلام کے نام پر کچھ بولنے کا حق تو آپ سے ضرور ہی چھین لیا جائے گا۔

یہ تو اولیاتِ[1] ایمان کی ایک مثال تھی۔ اب بیچ کی ساری منزلوں کو

---

[1] اگرچہ ہمارے بعض ارباب علم کو اس حقیقت سے انکار ہے کہ حاکمیت الٰہ کا تصور اولیات ایمان میں سے ہے، ان کے خیال میں یہ تصور یا عقیدہ، توحید کے ثانوی تقاضوں میں سے ہے نہ کہ بنیادی۔ لیکن وہ اپنی اس رائے پر کوئی باوزن دلیل نہیں دیتے۔ ہمارے خیال میں حاکمیت الٰہ کی بابت ان کا یہ نظریہ موجودہ ناسازگار حالات اور ملی مسائل کو حد سے زیادہ دی ہوئی اہمیتوں کے غیر شعوری دباؤ کا نتیجہ ہے۔ ہمارے اس خیال کی تائید ان کے عام طرز عمل سے بھی ہوتی ہے۔ کیونکہ ملت کی اکثریت صریح طور پر عملاً

(باقی صفحہ ۲۵۲ پر)

چھوڑ کر ایک آخری مثال لے لیجیے جس کا تعلق ملت کے اجتماعی بنیادی مسائل کے بجائے آپ کی انفرادی زندگی سے، اور ایمانیات وعبادات جیسے مبادی اسلام کے بجائے اخلاق ومعاملات سے ہے:۔

آپ ایک دوکان کھولتے ہیں۔ کتاب وسنت کی طرف سے آپ کو کچھ ہدایتیں دی جاتی ہیں۔ ان کا مطالبہ ہوتا ہے کہ کاروبار میں ان کی پیروی کی جائے مثلاً یہ کہ لین دین میں جھوٹ نہ بولو، دھوکا نہ دو، رشوت کے پاس نہ جاؤ، سود لینے اور دینے سے مجتنب رہو، بھاؤ بڑھانے کے لیے ضروریات زندگی کو بازار سے غائب کر کے ان کا ذخیرہ نہ کرو، وغیرہ۔ لیکن بازار کا چند روزہ ہی کا تجربہ آپ سے کہتا ہے کہ جھوٹ اور فریب کے بغیر کاروبار چل نہیں سکتا، رشوت نہ دوگے تو کوٹا نہ ملے گا، حساب کتاب کے رجسٹروں میں جعل سازی

(بقیہ ص۲۵۱) اس عقیدۂ قرآنی کے خلاف سرگرم کار ہے، اور وہ ہیں کہ اس کی عملی مخالفت تو درکنار صاف صاف زبانی اظہار حق کی بھی ضرورت نہیں سمجھتے۔ مان لیجیے کہ یہ عقیدہ عقیدۂ توحید کا ثانوی تقاضا ہی ہے، مگر کیا توحید کا ایک ثانوی تقاضا اتنی اہمیت بھی نہیں رکھتا جتنی اہمیت کہ دین کے ان مسائل کو حاصل ہے جن کے ثانوی کیا "ثالثی" اور "رابعی" ہونے میں بھی کوئی کلام اور اختلاف رائے نہیں؟ لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ وہ اس طرح کے جزوی مسائل کے ضمن میں تو انتہائی جدوجہد کرتے رہتے ہیں جب کہ اس مسئلہ حاکمیت کو سرے سے قابل اعتنا سمجھتے ہی نہیں۔

نہ کروگے تو سارا منافع سیل ٹیکس کی بھینٹ چڑھ جائے گا، سود سے بچوگے تو مال اٹھانے کے لیے بنک قرض نہ دے گا۔ اب آپ کے لیے دو ہی راستے رہ جاتے ہیں، یا تو وقت کی اس "معاشی مجبوری" پر کتاب و سنت کی مذکورہ ہدایتوں کو بے تکلف قربان کر دیجیے، —— مگر یہ راستہ ایمان کا راستہ نہ ہوگا —— یا ٹوٹے پھوٹے کاروبار پا اکتفا کیجیے، اور ان معاشی ترقیوں کا دروازہ از خود اپنے اوپر بند کر لیجیے جن کو حاصل کرنے کے لیے ان شرعی حدود کو پھاندتے رہنا ضروری ہے۔ اور یہی ایمان کا راستہ ہوگا —— دوکان پر بیٹھ کر اگر آپ نے ایسا کیا تو اس کے معنی یہ ہوں گے کہ آپ نے اپنے مقام کو بھی پہچانا اور ان معاشی "رکاوٹوں" کو بھی پہچانا یعنی آپ نے ان رکاوٹوں کو رکاوٹ نہیں سمجھا، بلکہ انہیں حق پرستی اور ادعائے ایمانی کی ناگزیر آزمائش سمجھا۔

ان ہی دو مثالوں پر باقی اور سارے مسائل کو بھی قیاس کر لیجیے، شاید ہی زندگی کا کوئی شعبہ اور میدان فکر و عمل کا کوئی گوشہ ہو جس میں اللہ کے دین پر آپ اخلاص کے ساتھ چلنا چاہیں اور مشکلات و مصائب راہ روک کر کھڑے نہ ہو جائیں، اور اپنوں اور غیروں، سب کی طرف سے دل آزار طعنوں، پروپیگنڈوں، بہتان تراشیوں، مخالفتوں اور ایذا رسانیوں کا سیلاب اُمنڈ نہ آئے۔ ان حالات میں آپ کے ایمان کا تقاضا صرف یہ ہوگا کہ ان مصائب سے آپ شکستہ خاطر نہ ہوں، انہیں خلاف توقع نہ سمجھیں، ان سے بھاگنے

کی کوشش نہ کریں، اور ھٰذَا مَا وَعَدَنَا اللّٰہُ وَرَسُوْلُہٗ، کہہ کر ان کو انگیز کریں، اور یقین رکھیں کہ یہ میرے ایمان کی آزمائش ہو رہی ہے۔ وہ آزمائش جو ہر مدعی ایمان کے لیے سنت الٰہی میں ازل سے مقرر ہے، اور جس پر اساس دین کے ایک ضروری سنگ تعمیر —— صبر —— کا وجود اور اعتبار وجود منحصر ہے

لیکن اس میں شبہ نہیں کہ فکر کی یہ پختگی اور نظر کی یہ راستی کوئی معمولی چیز نہیں، اس کے لیے بجائے خود بڑی مضبوط قوتِ ارادی اور عزیمت درکار ہے۔ اگر انسان کے اندر سچا ذوق ایمانی، مضبوط احساس ذمہ داری، اور غیر متزلزل آمادگی عمل موجود نہ ہو، اور اس میں مشکلوں سے بھاگنے کی جبلی کمزوری چھپی ہو تو ایسے مواقع پر وہ اپنے کو بڑی آسانی سے باور کرالے گا کہ "ان باتوں کا میرے ایمان سے کوئی تعلق نہیں، مجھے رفتار زمانہ کے خلاف چلنے کا مکلف کب بنایا گیا ہے۔ پھر یہ دنیا کے معاملات ہیں، ان میں ایک حد تک توخیر پسندی کا مظاہرہ کیا جاسکتا ہے، لیکن شریعت کے نظری مطالبوں پر جم جانا عاقبت نا اندیشانہ انتہا پسندی بلکہ تہور ہے۔ جب اصل ارکان دین —— نماز، روزہ، حج اور زکوٰۃ —— پر عمل کر لیتا ہوں تو اس کے معنی یہ ہیں کہ میں نے اپنی واقعی ذمہ داریاں پوری کر لیں، اور اس سے زیادہ کا بحالات موجودہ مجھ سے کوئی ضروری مطالبہ نہیں ——"

جب لسان غیب کی صریح ترجمانیوں اور منطوق شہادتوں کے ہوتے ہوئے بھی سہل پسند طبیعتوں نے راہ فرار ڈھونڈھ نکالنے میں کوتاہی نہ کی، اور نبی کے سامنے بھی حیلوں، تاویلوں اور معذرتوں کے سایۂ عاطفت میں وہ پناہ گیر ہوتی ہی رہیں حتیٰ کہ دوسروں کے لیے بھی "لاتفتنی" اور "لو نعلم قتالاً لا تبعناکم" کے عذرات رہنمائی کے لیے چھوڑ گئیں۔ تو آج ایسی ذہنیتوں کو اس حیلہ جوئی اور گریز پائی سے کون روک سکتا ہے؟ اور کون ہے جو ان کی اس طرح کی کج اندیشیوں اور خوش گمانیوں کو دور کر کے انہیں قانون ابتلاء کے نفاذ کا قائل کر سکے؟ جب کہ اللہ تعالیٰ کی وحی اور نبی کی زبان بھی ان آزمائشی واقعات کی صحیح نوعیت واضح کرنے کے لیے اب موجود نہیں رہی اور فیصلے کا سارا انحصار خود اپنی رائے پر رہ گیا ہے۔ اپنے ہی خلاف فیصلہ دینا کچھ ہنسی کھیل تو نہیں۔

صبر کا سرچشمہ نماز ہے

تفصیلات بالا سے دو باتیں اچھی طرح واضح ہو چکیں۔ ایک تو یہ کہ صبر تعمیر دین کے سلسلہ میں ایک ایسی بنیادی ضرورت ہے جس کے بغیر اللہ تعالیٰ کے حضور ایمان کا معتبر ہونا امر دشوار ہے۔ دوسری یہ کہ صبر دراصل قوت ایمانی کا دوسرا نام ہے۔ اب ہمیں یہ جاننا ہے کہ یہ بیش بہا دولت ملتی کہاں سے ہے؟ تاکہ اس کے حاصل کرنے کی سعی و تدبیر کی جا سکے۔

لیکن اس فکر و جستجو سے پہلے ایک بات اور سمجھ لینے کی ہے، اور وہ یہ کہ

اس صبر مطلوب سے ہماری اصل مراد جوہر استقلال کی وہ مقدار نہیں ہے جو کسی انسان کو پیدائشی طور پر عطا ہوئی ہوتی ہے۔ کیونکہ بوقت ضرورت صبر و استقلال کی اس مقدار کا مظاہرہ تو ہر شخص از خود کیا ہی کرتا ہے، خواہ وہ مومن ہو خواہ کافر، اس سے تو کوئی انسان بھی بے بہرہ نہیں ہوتا، کم و بیش ہر شخص کو یہ صفت خلقی طور پر ودیعت کی گئی ہے، اور کھلی بات ہے کہ جو چیز وہبی اور پیدائشی ہو اصل محلِ آزمائش وہ نہیں ہوتی، بلکہ آزمائش حقیقتاً اس چیز میں ہوتی ہے جس میں انسان کی اپنی سعی وجہد کا دخل ہو۔ پس صبر و ثبات کی جو قوت اس وقت ہمارا موضوع بحث ہے وہ وہ قوت ہے جو اس پیدائشی قوتِ استقلال سے زائد اور اس کے بعد کی ہو، جو از خود حاصل شدہ نہ ہو، بلکہ انسان کے اپنے کسب سے حاصل کی ہوئی ہو، اور جو اصولاً محل ابتلا بن سکے۔ اب آیئے یہ دیکھیں کہ اس قوتِ صبر کی سوتیں کہاں ہیں؟

ارشاداتِ الٰہی پر جب ہم اس غرض کو لے کر نظریں ڈالتے ہیں تو اس کا ایک خاص اندازِ بیان ہماری نگاہوں کو ٹھٹکا دیتا ہے۔ ہم پاتے ہیں کہ جہاں کہیں ابتلاؤں اور مشکلوں کا ذکر اور ان کے مقابلہ میں صبر کا مطالبہ ہوتا ہے وہاں یادِ الٰہی کی، نماز کی، حمد و تسبیح کی، اور دعا و التجا کی تلقین عموماً ضرور ہی موجود ہوتی ہے۔ بطور مثال چند آیتیں ملاحظہ ہوں:۔

فَاصْبِرْ لِحُكْمِ رَبِّكَ وَ | پس اے نبی! اپنے رب کے حکم کے لیے جم

وَلَا تُطِعْ مِنْهُمْ آثِمًا أَوْ كَفُورًا ۝ وَاذْكُرِ اسْمَ رَبِّكَ بُكْرَةً وَأَصِيلًا ۝ وَمِنَ اللَّيْلِ فَاسْجُدْ لَهُ وَسَبِّحْهُ لَيْلًا طَوِيلًا ۔

(دہر)

جاؤ، اور ان (اعداء دین) میں سے کسی بھی ناحق گذار اور ناشکرے کی بات نہ مانو۔ اپنے رب کا نام صبح و شام لیا کرو، اور شب کے اوقات میں بھی اس کو سجدہ کرو، اور اس کی طویل گھڑیاں تسبیح میں گذارو۔

فَاصْبِرْ عَلَىٰ مَا يَقُولُونَ وَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ قَبْلَ طُلُوعِ الشَّمْسِ وَقَبْلَ غُرُوبِهَا وَمِنْ آنَاءِ اللَّيْلِ وَأَطْرَافَ النَّهَارِ

(طٰہٰ)

یہ لوگ جو کچھ (اذیت دہ باتیں) کہتے رہتے ہیں ان پر صبر کرو، اور اپنے رب کی حمد کرتے ہوئے اس کی تسبیح میں مصروف رہو؛ سورج نکلنے سے بھی پہلے اور سورج ڈوبنے سے بھی پہلے، رات کے کچھ اوقات میں بھی اور دن کے کناروں پر بھی۔

سورۂ مزمل کے حسب ذیل الفاظ خاص طور سے نگاہ میں رکھیے:-

يَا أَيُّهَا الْمُزَّمِّلُ ۝ قُمِ اللَّيْلَ إِلَّا قَلِيلًا ۝ نِصْفَهُ أَوِ انْقُصْ مِنْهُ قَلِيلًا ۝ أَوْ زِدْ عَلَيْهِ وَرَتِّلِ الْقُرْآنَ تَرْتِيلًا ۝ إِنَّا سَنُلْقِي عَلَيْكَ قَوْلًا ثَقِيلًا ۝ إِنَّ نَاشِئَةَ اللَّيْلِ هِيَ

اے کملی پوش! کچھ حصے کے سوا باقی رات نماز میں کھڑے ہو کر گذارو۔ آدھی رات، کم یا اس میں کچھ کم کر لو یا کچھ زیادہ۔ اور اس میں خوب ٹھہر ٹھہر کر قرآن پڑھو۔ اس لیے کہ ہم تم پر ایک بھاری بات کی ذمہ داری ڈالنے

اَشَدُّ وَطْأً وَّاَقْوَمُ قِيْلًا اِنَّ لَكَ فِي النَّهَارِ سَبْحًا طَوِيْلًا وَاذْكُرِ اسْمَ رَبِّكَ وَتَبَتَّلْ اِلَيْهِ تَبْتِيْلًا رَبُّ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ لَا اِلٰهَ اِلَّا هُوَ فَاتَّخِذْهُ وَكِيْلًا وَاصْبِرْ عَلٰى مَا يَقُوْلُوْنَ وَاهْجُرْهُمْ هَجْرًا جَمِيْلًا۔

نے والے ہیں۔ بلاشبہ رات کا اٹھنا ہر پہلو سے خوب تر ہے، اس پہلو سے بھی کہ رات میں قدم خوب جمتے ہیں، اور اس پہلو سے بھی کہ منہ سے بات خوب درست نکلتی ہے۔ یقیناً تمہیں دن میں بڑی دوڑ دھوپ کرنی ہوتی ہے۔ اور اپنے رب کا نام یاد کرو، اور اس کی طرف پوری یکسوئی کے ساتھ متوجہ ہو رہو۔ وہ مشرق و مغرب سب کا آقا ہے۔ اس کے سوا کوئی معبود نہیں ہے۔ پس اس کو اپنا کارساز بنا لو، اور یہ کفار تمہاری مخالفت میں جو کچھ کہتے رہتے ہیں اس پر صبر کرو اور انہیں بڑی خوبی کے ساتھ نظر انداز کر دو۔

صبر اور ذکر و تسبیح کی یہ ظاہری ہم رشتگی بلاوجہ نہیں ہو سکتی، بلکہ دونوں میں کسی گہرے اندرونی ربط ہی کی بنا پر ہے۔ یہ ربط اس کے سوا اور کچھ نہیں ہو سکتا کہ ذکر اور نماز ہی وہ سرچشمہ ہے جس سے صبر کی قوت پیدا ہوتی اور حاصل کی جا سکتی ہے۔ جب مصائب و آلام کے مقابلہ میں صبر کی تلقین کی گئی تو ضروری تھا کہ وہ ذریعہ بھی بتا دیا جائے جس سے یہ متاعِ بے بہا دستیاب ہوتی ہے۔ سو فرمایا گیا کہ اللہ کو یاد کرو، تمہارا دل توانائیوں سے بھر جائے گا، پھر نہ تو مصیبتوں کے زلزلے تمہیں جنبش دے سکیں گے، نہ

مرغوباتِ دنیا کی فراوانی تمہیں ڈگمگا سکے گی۔ یہی وجہ ہے کہ جب کبھی رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم پریشان خاطر ہوتے تو نماز میں مشغول ہو جاتے، گویا ایک پیاسا برفاب کی طرف لپک رہا ہو (اِذَا حَزَبَہٗ اَمْرٌ صَلّٰی) گو اسوۂ رسول کی روشنی میں یہ حقیقت پوری طرح بے نقاب ہو جاتی ہے۔ لیکن اگر مزید شہادت درکار ہو تو قرآن کے ان لفظوں کو پڑھیے:۔

اِنَّ الْاِنْسَانَ خُلِقَ هَلُوْعًا	بلاشبہ انسان تھڑدلا پیدا کیا گیا ہے جب
اِذَا مَسَّهُ الشَّرُّ جَزُوْعًا وَّاِذَا	اسے بدحالی لاحق ہوتی ہے تو سخت بے قرار
مَسَّهُ الْخَيْرُ مَنُوْعًا اِلَّا الْمُصَلِّيْنَ الخ	ہو جاتا ہے۔ اور جب اچھے دن ہوتے ہیں

تو بڑا کنجوس ثابت ہوتا ہے، سوائے نمازیوں کے ،الخ

گویا تھڑدلا پن انسان کی عام جبلی کمزوری ہے، ذرا مصیبت پڑی اور بلبلا اٹھا اور اگر کچھ اچھے دن آگئے تو آپے سے باہر ہو چلا، اور اس کمزوری کا علاج صرف نماز ہے۔ اگر اسی بات کو یوں کہہ دیا جائے کہ "بے صبری کا علاج صرف نماز ہے" تو گو الفاظ بدل جائیں گے مگر حقیقت نہ بدلے گی۔

نیز:۔

وَاصْبِرْ وَمَا صَبْرُكَ	صبر کرو، اور یہ بھی یاد رکھو کہ، تمہیں صبر
اِلَّا بِاللّٰهِ	اللہ کے ذریعے حاصل ہوگا۔

اس جملے کے حقیقی مفہوم پر اس بحث کی روشنی میں غور فرمائیے جو

"حقیقت نماز" کے زیرِ عنوان گذر چکی ہے، جس میں آیت "اِسْتَعِیْنُوْا بِاللّٰہِ وَاصْبِرُوْا" کے حوالے سے ہم نے بتایا ہے کہ "استعانت بالصلوٰۃ" اور "استعانت باللہ" دونوں ایک ہی چیز ہیں، ایک ہی ارشاد ہے جس کے لیے دو تعبیریں اختیار کی گئی ہیں۔ ایک جملہ میں جس جگہ صلوٰۃ کا لفظ ہے دوسرے میں اسی جگہ اللہ کا لفظ ہے۔ تا یہ واضح ہو کہ نماز اللہ کے قرب بلکہ اس کی معیت کا نام ہے، اس لیے جسے اللہ سے استعانت کرنی ہو وہ نماز میں مشغول ہو جائے۔ اب آیت زیرِ بحث میں جب ہمیں یہ بتایا جاتا ہے کہ صبر کی دولت اللہ تعالیٰ ہی کے ذریعہ ملتی ہے تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ اسے نماز میں ڈھونڈھنا چاہیے، وہی اس کا منبع ہے، وہی دلوں کے سکون کا سرچشمہ ہے اور وہی اللہ تعالیٰ کی ثبات بخشیوں کا اصل ذریعہ ہے حتیٰ کہ بیجا نہ ہوگا اگر اللہ کا نام حذف کر کے یوں کہہ دیا جائے کہ نماز ہی صبر و ثبات کا منبع اور ذکرِ حق ہی طمانیتِ قلب کا سرچشمہ ہے۔ اَلَا بِذِکْرِ اللّٰہِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوْبُ۔

نفسِ مطمئنہ اور قلبِ صابر

کچھ عجب نہیں جو آپ ان آخری لفظوں پر چونک پڑیں، اور آپ کو اس جگہ یہ دیکھ کر اختلالِ بیان کا گمان گذرنے لگے کہ یہاں ذکر تو ابتلائی مصائب پر صبر و استقامت کا تھا مگر اب یکایک اس کے ساتھ سکونِ قلب و طمانیت

نفس کا نام بھی آگیا ہے، صرف نام ہی نہیں آیا ہے بلکہ اسے ایک مترادف لفظ کی حیثیت سے استعمال کیا گیا ہے، درآں حالیکہ عرف عام میں اطمینان نفس اور نفس مطمئنّہ ایک روحانی اصطلاح ہے، بہت بلند، نہایت مقدس، جو عبارت ہے عشق الٰہی میں محو ہو جانے سے، جو نام ہے مشاہدۂ جمال ربّانی کی سرور انگیزیوں میں ڈوب جانے کا، جسے زندگی کے ہنگاموں اور افکار کی کشاکشوں سے کوئی تعلق ہی نہیں ہوتا۔ لیکن ہم یاد دلائیں گے کہ ہماری یہ گفتگو قرآن حکیم کی بولی میں ہو رہی ہے۔ اور اس بولی میں انتہائے صبر اور اطمینانِ نفس —— یا قلب صابر اور نفس مطمئنّہ —— کے مابین ایسا گہرا لگاؤ ہے کہ ایک دوسرے کے بغیر تصور نہیں کیا جا سکتا۔ اطمینان نفس ہے کیا؟ اطمینان نفس دراصل نام ہے دو باطنی کیفیاتِ کمال کے مجموعہ کا:-

(۱) اللہ تعالیٰ کی ایسی گہری معرفت، اور اس کی صفات و لوازم صفات کا ایسا سچّا یقین کہ شک و ریب کی کوئی کھٹک بھی باقی نہ رہ جائے۔

(۲) قلب کی وہ مضبوطی جو نہ تو مصائب کو ادائے فرض کی راہ میں حائل ہونے دے اور نہ خوش حالیوں کو اس امر کی اجازت دے کہ مقصودِ حق سے انسان کا منہ مڑ مڑ جائے۔

گویا اطمینان نفس علمی کمال اور عملی کمال، دونوں کا مجموعہ ہے۔ پس اگر اس میں سے علمی و عرفانی پہلو کو نکال دیجیے تو جو کچھ بچے گا اسی کا نام

صبر و استقامت ہے۔ ایسی حالت میں اگر یہ کہا جائے کہ اطمینان نفس کی صفت کا تبلیغی مجاہدات اور ابتلائی مصائب سے کوئی تعلق نہیں تو یقیناً یہ ایک اچنبھے کی بات ہوگی۔ پھر یہ اچنبھا اور بڑھ جائے گا اگر آپ یہ دیکھیں کہ ان دونوں پہلوؤں میں باہم بھی کوئی بے نیازی نہیں بلکہ زبردست تلازم موجود ہے۔ یعنی اللہ کی گہری معرفت اور محبت ہی یہ تقاضا کرتی ہے کہ اس کی مرضیات کے لیے سب کچھ قربان کر دیا جائے۔ ورنہ وہ علم و یقین ہی کیا، جو اپنے لوازم کے لیے مضطرب نہ کر دے! وہ محبت کیسی، جو محبوب کے اشاروں پر نقد جان نثار نہ کرا دے! اس کمالِ عشق کو کیا کہیے جو اللہ کی مقرر کردہ آزمائش گاہوں سے بھاگ کھڑا ہو! جو اقامتِ دین کی جدوجہد سے کنی کاٹ جائے! جو اللہ تعالیٰ کے پسندیدہ احکام کی علانیہ پامالی اور اس کے نازل کردہ نظام زندگی کی کس مپرسی دیکھ رہا ہو اور اس کا سکون درہم برہم نہ ہو جائے! عقل، نقل، ذوقِ ایمان، وجدانِ بندگی، کوئی چیز بھی اس ناممکن بات کو ممکن نہیں مان سکتی۔ اس لیے حق تو یہ ہے کہ اطمینان نفس کا یہ عرفانی پہلو بھی خود اپنا وجود ثابت کرنے کے لیے اس بات کا محتاج ہے کہ اس میں اقامت حق کے لیے انتہائی اضطراب اور راہ حق کی لازمی آزمائشوں کے لیے پختہ عزم استقامت موجزن ہو۔ جس حد تک اس اضطراب میں کمی، اور اس عزم استقامت میں ناپختگی ہوگی اسی حد تک اس اطمینان نفس کا علمی، اور عرفانی پہلو بھی خام سمجھا

جائے گا۔ یوں اطمینان نفس کا حقیقی اور قابل لحاظ معیار یہی اضطراب اور یہی عزم استقامت ٹھیرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن حکیم میں ایمان کے مدعیوں سے یہ مطالبہ تو بار بار ہوتا ہے کہ اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرو، اور وہ ایمان کی ناگزیر ابتلاؤں پر صبر سے کام لو، مگر اس امر کا تذکرہ مطالبے کی زبان میں ہمیں کہیں بھی نظر نہیں آتا کہ اللہ کی محبت کرو، اس کے تصوّر جمال میں ڈوب جاؤ، اس کے کیف عشق میں کھو جاؤ۔ بلکہ اس کا ذکر جب بھی آتا ہے تو محض ایک صفت ایمانی کے طور پر آتا ہے۔ وہ اَلَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰہِ (اہل ایمان سب سے زیادہ اللہ کی محبت رکھتے ہیں) تو ضرور فرماتا ہے مگر یہ کہیں نہیں کہتا کہ احبوا اللہ (اللہ کی محبت کرو) جب کہ اَطِیْعُوا اللّٰہَ اور اِصْبِرُوْا۔ کی صدائیں اس کے ایک ایک گوشہ سے بلند ہوتی سنائی دیتی ہیں۔ اس فرق کی بڑی وجہ، ماسوا دیگر وجوہ کے، صرف یہ ہے کہ اطاعت اور صبر و مجاہدہ خود محبت الٰہی کو مستلزم ہے، اس کا مظہر ہے، اس کے وجود کا تنہا گواہ ہے، اور اس کے بغیر عملاً اس کا تصوّر ہی نہیں کیا جا سکتا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اور آپ کے بعد آپ کے سچے پیرؤں کی زندگی اس حقیقت کی شاہد عدل ہے۔ ایمان، معرفت، محبت اور عشق واطمینان نفس کی جو دولت آپ کو ارزانی ہوئی تھی، کسی بڑے سے بڑے عارف کو نہ وہ کبھی نصیب ہوئی اور نہ ہوگی۔ مگر جس مبارک

سینے میں یہ نفسِ مطمئنہ موجود تھا اسی کے اندر قلق و اضطراب کی وہ بھٹی بھی سلگ رہی تھی جس کی جان سوزیوں نے زندگی کا سارا سکون چھین لیا تھا۔ جیسے ہی اس سب سے بڑے عاشقِ خدا پر محبوبِ حقیقی کی مرضیات کا انکشاف ہوا، غارِ حرا کی پُرسکون فضا سے باہر نکل آیا اور مجبور ہو گیا کہ بوقبیس کی چوٹیوں پر، منیٰ کے بازاروں میں، خانہ کعبہ کے صحن میں، مکہ کی گلیوں میں، طائف کے تاکستانوں میں شعبِ ابی طالب کی تنگنائیوں میں، غارِ ثور میں —— اور پھر بدر میں، احد میں، حنین میں، تبوک میں دل کا سکون ڈھونڈھے، حتیٰ کہ وہ خود جس کے حکم پر اور جس کی رضا کے لیے یہ سب کچھ ہو رہا تھا، رہ رہ کر ٹوکتا رہا۔

طٰہٰ مَا اَنْزَلْنَا عَلَیْکَ الْقُرْاٰنَ لِتَشْقٰی (طٰہٰ)	طاہا، ہم نے تم پر قرآن اس لیے نازل نہیں کیا ہے کہ مشقت میں مبتلا ہو جاؤ۔
فَلَعَلَّکَ بَاخِعٌ نَّفْسَکَ عَلٰٓی اٰثَارِھِمْ اِنْ لَّمْ یُؤْمِنُوْا بِھٰذَا الْحَدِیْثِ اَسَفًا (کہف)	اگر یہ لوگ اس قرآن پر ایمان نہ لائیں تو شاید تم مارے غم کے اپنے آپ کو ہلاک کر لوگے۔

مگر اس کے باوجود حیاتِ طیبہ کا ایک ایک ورق بتاتا ہے کہ اس اضطراب میں عملاً کوئی کمی نہیں ہوئی۔ بس ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اس فعل کی حد تک قلبِ نبوی خود اپنے قابو میں نہیں، اور ایک شوق بے اختیار

ہے جو کسی حال میں بھی چین نہیں لینے دیتا، دنیا کی ہر برائی اور گمراہی اصلاحِ احوال کی دعوت دیتی رہتی ہے اور آپ یہ دعوت رد کر دینے سے قطعاً معذور ہیں۔ کیا اس کے سوا بھی اطمینانِ نفس اور نفسِ مطمئنہ کی کوئی اور شرح و تعبیر ہمارے لیے قابلِ قبول ہو سکتی ہے؟ درآں حالیکہ ہم سے کہا گیا ہے:-

لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِيْ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ (احزاب) — تمہارے لیے اللہ کے رسول میں ایک عمدہ نمونۂ عمل ہے۔

اور یہ کہتے وقت بھی رسول کی پوری زندگی میں سے چھانٹ کر خصوصیت کے ساتھ وہی لمحہ ہمارے سامنے رکھا گیا ہے جب آپ محاذِ جنگ پر تیروں کی بارش میں کھڑے نظر آتے ہیں، ہاتھوں میں پھاوڑا ہے، پیٹ پر پتھر بندھے ہوئے ہیں اور اپنے ساتھیوں کے ساتھ خندق کھودنے میں مصروف ہیں۔ اس میں تو کوئی کلام نہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی پوری زندگی ہی ہمارے لیے اسوۂ حسنہ ہے، پھر اگر اسے اسوۂ حسنہ قرار دیتے وقت اس کے ہزاروں محامد اور مکارم میں سے اسی وصفِ خاص کا اللہ جل شانہ نے انتخاب فرمایا تو اس کی بھی کوئی وجہ ہونی چاہیے۔ یہ وجہ اس کے سوا اور کچھ نہیں کہ یہی وصف سچے ایمان اور اخلاص کا سب سے زیادہ حقیقی معیار ہے۔

ایک اور غلط فہمی اسی سے ملتی جلتی ایک اور حقیقت بھی ہے جس پر کچھ

اسی طرح کی غلط فہمیوں کے پردے پڑ گئے ہیں، ضرورت ہے کہ اس کی بھی تنقیح کر دی جائے۔

کہا جاتا ہے کہ نماز پڑھو، اطاعتِ حق اور اقامتِ دین کی ذمہ داریوں سے سبکدوش ہو جاؤ گے، اور پھر کوئی نعمت اور سعادت نہیں جو اس دنیا میں مل سکتی ہو اور تمہیں نہ ملے۔" بات اتنی سچی ہے کہ اس سے زیادہ سچی بات اس آسمان کے نیچے کوئی نہیں کہی گئی۔ لیکن عموماً اس کا جو مطلب لیا جاتا ہے اس کو بھی ایسا ہی سچا سمجھنا انتہائی دشوار ہے۔ نماز پڑھنا فی نفسہٖ اطاعت حق اور اقامتِ دین کے ہم معنی نہیں ہے، بلکہ نماز پڑھنے سے صرف وہ قوتِ ایمانی نشو و نما پاتی ہے جس کے بل پر اطاعت حق اور اقامتِ دین کا فرضِ گراں ادا کیا جا سکتا ہے۔ اب اگر آپ سرے سے نماز کی اس افادیت ہی سے غافل ہوں یا اس کی بخشی ہوئی قوتوں سے کام ہی نہ لیں، اور کفر و جاہلیت کی ان یلغاروں سے کترا کترا کر نکل جائیں جن کا مقابلہ کرنے کے لیے یہ قوتیں آپ نے اکٹھی کی تھیں، تو قیامت تک دینِ حق کی مظلومی اسی حال میں قائم رہے گی، اور باطل یوں ہی آپ کے دائیں، بائیں، آگے، پیچھے، حتیٰ کہ آپ کے منبر و محراب تک پر مسلط رہے گا۔ لاریب نماز بہت بڑی چیز ہے، خیر کل ہے، منبع دین ہے، سراپا قوتِ انقلاب ہے، اور اتباعِ دین و اقامتِ دین کا تیر بہدف نسخہ ہے۔ لیکن اس کی

برکتوں کے ظہور کے لیے ضروری ہے کہ اس کے سامنے کوئی ہدف بھی تو ہو ورنہ وہ اپنی شانِ تسخیر کا کوئی کارنامہ کیوں کر انجام دے گی؟ یہ ہدف تو اس کو اسی وقت میسر آ سکتا ہے جب آپ سکون کے گوشوں سے نکل کر حق و باطل کی کشمکش میں اپنے آپ کو ڈال دیں، اور اہم معاملاتِ زندگی سے لاتعلقی کا تعلق ختم کر کے ان کا رُخ ہدایاتِ قرآنی کے مطابق موڑ دینے کی جدوجہد میں لگ جائیں۔ پھر دیکھیں کہ فی الواقع نماز میں کیا قوتیں چھپی ہوئی ہیں، اور کس طرح ان کے نتائج ایک فطری رفتار کے ساتھ ظہور میں آتے جا رہے ہیں۔ اس وقت ہو گا یہ کہ آپ جاہلی افکار، اعمال اور قوئ سے پنجہ آزمائی کریں گے، وہ خشمناک ہو ہو کر آپ پر حملے کریں گے، طبعاً آپ گھبرا اٹھیں گے، مگر فوراً ہی اللہ کا نام دل میں سکینت کی ٹھنڈک پیدا کر دے گا آپ ان حملوں کا مقابلہ کریں گے، اور سنتِ الٰہی کے مطابق ابتلائی مصائب سے گذرتے ہوئے بتدریج آگے بڑھتے جائیں گے یہاں تک کہ منزلِ مقصود کو پہنچ جائیں گے۔ یوں ذکر و نماز کی پیدا کردہ قوتیں بجائے اس کے کہ غیر محسوس شکل میں معطل پڑی رہیں، اپنے لیے صحیح مصرف پاتی جائیں گی جہاں وہ ٹھیک اس مقصد کے لیے خرچ ہوں گی جس کے لیے مہیا کی گئیں تھیں۔ "خرچ" اس معنی میں نہیں کہ اس استعمال سے ختم ہوتی جائیں بلکہ اس معنی میں کہ غیر معمولی خیر و برکاتِ دینی کا ذریعہ بنیں گی۔ ورنہ کوئی مادی چیز تو ہیں نہیں کہ استعمال کرنے سے ختم ہو جائیں، یہاں ختم

ہونے کا کیا سوال، ان کا استعمال تو انسان کو اور دو آتشہ بنا دیتا ہے۔ ان کا حال تو ایک عمدہ تلوار کا سا ہے جس کی کاٹ، اسی قدر بڑھتی جاتی ہے جتنی وہ خرچ کی جاتی ہے اور اتنی ہی ناقابل اعتماد ہوتی ہے جتنی وہ بچا بچا کر رکھی جاتی ہے۔ اللہ کی یاد اور نماز سرِ باطل کو اڑا دینے اور رگِ منکر کو کاٹ کر رکھ دینے کی بے نظیر قوتیں اپنے اندر رکھتی ہے اور وہ حق و صلاح کا تنہا ہتھیار ہے۔ اللہ کا دین مطالبہ کرتا ہے چیختا اور چلاتا ہے کہ اس ہتھیار کو استعمال کرو اور شر و بطالت کی جڑیں کاٹ کر رکھ دو مگر وہ گھٹ گھٹ کر رہ جاتا ہے جب دیکھتا ہے کہ اس کے حمایتی سخت گراں گوش ہیں۔ اور کچھ عجیب قسم کی سرشاریوں میں محو ہیں، وہ بس ہتھیار بنائے جا رہے ہیں اور اسے مانجھے جا رہے ہیں، مگر اسے اٹھانے کا نام نہیں لیتے، نام لینا تو درکنار اس کا تصوّر بھی کرنے کے لیے تیار نہیں، اور نہیں جانتے کہ اس طرح وہ کتنا بھاری نقصان اٹھا رہے ہیں۔ ایک طرف تو وہ ایک بڑے فائدے کے حصول سے محروم ہو رہے ہیں، دوسری طرف اپنے بنیادی فرضِ منصبی کی ادائگی میں کوتاہ ثابت ہو رہے ہیں اور صرف یہی نہیں بلکہ خود اس ہتھیار کے فطری نشو و نما کو بھی نقصان پہنچا رہے ہیں اور نادانستہ اس کی دھاروں کو زنگ خوردہ بنا رہے ہیں۔ اس لیے جو نماز باطل اور منکر سے نبرد آزما ہونے پر نہیں ابھارتی، نفسیات کا فیصلہ یہ ہے کہ وہ اسے بتدریج برداشت کرنے لگتی ہے۔

اگر خدانخواستہ کوئی نماز اس حد تک "رواداری" ہو جائے تو اسے قانون کی زبان میں جو چاہے کہہ لیجیے، مگر از روئے واقعہ اسے نماز کہنا بہت مشکل ہے نماز تو اس لیے نہیں مشروع ہوئی تھی کہ حق و باطل کو باہم گلے ملوا دے بلکہ اس لیے مشروع ہوئی تھی کہ ان میں تلوار چلوا دے۔

MC LIBRARY Nankana Sahib
02160NS
21-9-2022
Managed by Chughtai Public Library

تصانیف سید ابوالاعلیٰ مودودی

۱. دینیات	مولانا مودودی	۲/-/-
۲. خطبات	" "	۳/۸/-
۳. اسلامی عبادت پر ایک تحقیقی نظر	" "	۱/۱/-
۴. تفہیمات حصہ اوّل	" "	۴/-/-
۵. تفہیمات حصہ دوم	" "	۴/-/-
۶. مسئلہ جبر و قدر	" "	۱/۴/-
۷. بناؤ اور بگاڑ	" "	-/۹/-
۸. اسلام کا اخلاقی نقطۂ نظر	" "	-/۶/-
۹. اسلام اور جاہلیت	" "	-/۴/-
۱۰. تحریکِ اسلامی کی اخلاقی بنیادیں	" "	-/۸/-
۱۱. سلامتی کا راستہ	" "	-/۹/-
۱۲. دینِ حق	" "	-/۹/-
۱۳. شہادتِ حق	" "	-/۹/-
۱۴. قرآن کی چار بنیادی اصطلاحیں	" "	۱/۸/-
۱۵. الجہاد فی الاسلام	" "	۹/-/-

۱۶-	مسلمان اور موجودہ سیاسی کشمکش حصہ اوّل	مولانا مودودی	۱/۴/۰
۱۷-	〃 〃 〃 〃 حصہ دوم	〃 〃	۲/۸/
۱۸-	〃 〃 〃 〃 حصہ سوئم	〃 〃	۲/۸/
۱۹-	مسئلہ قومیت	〃 〃	۱/۸/
۲۰-	اسلام کا نظریہ سیاسی	〃 〃	-/۶/
۲۱-	جہاد فی سبیل اللہ	〃 〃	-/۶/
۲۲-	اسلامی حکومت کس طرح قائم ہوتی ہے	〃 〃	-/۶/
۲۳-	اسلامی قانون اور پاکستان میں اسکے نفاذ کی عملی تدابیر	〃 〃	۱/-/
۲۴-	مرتد کی سزا اسلامی قانون میں	〃 〃	-/۱۲/
۲۵-	مطالبۂ نظام اسلامی	〃 〃	-/۳/
۲۶-	آزادی کے اسلامی تقاضے	〃 〃	-/۳/
۲۷-	دستوری سفارشات پر تنقید و تبصرہ	〃 〃	-/۸/
۲۸-	دستوری تجاویز	〃 〃	-/۱/
۲۹-	اسلامی دستور کی تدوین	〃 〃	-/۱۲/
۳۰-	جماعت اسلامی کی انتخابی جدوجہد	〃 〃	-/۲/
۳۱-	منشور جماعت اسلامی	〃 〃	-/۲/-
۳۲-	انسان کا معاشی مسئلہ اور اس کا اسلامی حل		-/۸/

۳۳۔ سود حصہ اول	مولانا مودودی	۲/-/
۳۴۔ سود حصہ دوم	" "	۳/۰/
۳۵۔ مسئلہ ملکیت زمین	" "	۱/۴/
۳۶۔ پردہ	" "	۴/-/
۳۷۔ حقوق الزوجین	" "	۱/-/
۳۸۔ اسلام اور ضبط ولادت	" "	-/۱۲/
۳۹۔ تنقیحات	" "	۳/۰/
۴۰۔ نیا نظام تعلیم	" "	-/۶/
۴۱۔ ایک اہم استفتاء	" "	-/۳/
۴۲۔ اسلام کا نظام حیات	" "	-/۱۰/
۴۳۔ رسائل و مسائل	" "	۵/۴/
۴۴۔ تجدید و احیائے دین	" "	۱/۱۲/
۴۵۔ جماعت اسلامی کی دعوت	" "	-/۶/
۴۶۔ ہدایات	" "	-/۶/
۴۷۔ دعوت اسلامی اور اس کے مطالبات	مولانا مودودی، مولانا اصلاحی، میاں طفیل محمد	۲/۸/

مرکزی مکتبہ جماعتِ اسلامی پاکستان اچھرہ لاہور

MUNICIPAL LIBRARY
Na. ka.a
Sah.b.

مکتبہ جدید
انارکلی ۔ لاہور
ناشر و تاجر

مجموعہ تفاسیر فراہی رحمہ

تالیف: مولانا حمید الدین فراہی رحمۃ اللہ علیہ

ترجمہ: مولانا امین احسن اصلاحی

مولانا حمید الدین فراہی اس دور آخر میں تفسیر کے امام گذرے ہیں۔ انہوں نے قرآن پر فکر و تدبر کی نئی راہیں کھولیں اور اسکی وہ مشکلیں حل کیں جو اب تک تفسیر کی کتابوں میں حل نہیں ہوسکی تھیں۔ مولانا رحمۃ اللہ علیہ کی اصل تفسیر عربی میں ہے۔ اس کے جو اجزاء شائع ہو چکے تھے مولانا رحمۃ اللہ علیہ کے شاگرد خاص

مولانا امین احسن اصلاحی

نے ان کا شستہ اور شگفتہ اردو میں ترجمہ کر دیا ہے۔ اور شروع میں مصنف کے مختصر حالات زندگی بھی دے دئے ہیں اور مولانا حمید الدین فراہی کے مقدمہ تفسیر کا ترجمہ بھی شامل کر دیا ہے جو اصول تفسیر پر مولانا کے قلم سے ایک نہایت جامع رسالہ ہے۔ اس مجموعہ میں مقدمہ تفسیر کے علاوہ مندرجہ ذیل سورتوں کی تفسیروں کے ترجمے شامل ہیں:-

تفسیر آیہ بسم اللہ، تفسیر سورۂ فاتحہ، سورۂ ذاریات، سورۂ [illegible]
سورۂ تحریم، سورۂ عبس، سورۂ و الشمس، سورۂ والتین، سورۂ و[illegible]
سورۂ فیل، سورۂ کوثر، سورۂ کافرون، سورۂ لہب، سورۂ ا[illegible]

مولانا رحمۃ اللہ علیہ نے انمیں سے ہر تفسیر میں قرآ[illegible] کی ایسی اہم مشکلیں حل کی ہیں جو قرآن کے دوسرے مقامات کے حل کے لئے کلید کا کام دیتی ہیں اور یہ بات پورے اطمینان سے کہی جا سکتی ہے کہ اگر ایک شخص مولانا کے مقدمہ تفسیر قرآن کی روشنی میں ان تمام اجزاء کا بغور مطالعہ کرے تو وہ مولانا فراہی کے اسلوب فکر سے اچھی طرح آشنا ہو جائیگا اور قرآن پر محققانہ تدبر کے لئے اپنی راہیں خود کھول لیگا۔

تفسیری حقائق و معارف کا یہ مجموعہ ۲۵۲ صفحات $\frac{۲۶ \times ۲۰}{۸}$ سائز پر مشتمل ہے اور اس کے متعلق بلا تکلف یہ دعویٰ کیا جاسکتا ہے کہ اسکا ہر صفحہ تفسیری حقائق کا بیش بہا گنجینہ ہے۔ کتابت و طباعت نہایت نفیس جلد عمدہ کپڑے کی قیمت -/۱۴

مرکزی مکتبہ جماعت اسلامی پاکستان

سرورق جدید اردو ٹائپ پریس، لاہور میں طبع ہوا